

مرکز اہل السنۃ و الجماعت سرگودھا کا ترجمان

مدیر
مولانا محمد الیاس گھمن



شماره 11

نومبر 2016

جلد نمبر 5

• قادیانی اور افواج پاکستان

• ڈاکٹر مقام اور ذمہ داریاں

• حیات نانوتوی کی روشن قندیلیں

معمر افراد اور اسلامی تعلیمات

مرکز اہل السنۃ و الجماعۃ
www.ahnafmedia.com



فہرست

- 3 ----- معمر افراد اور اسلامی تعلیمات
اداریہ
- 7 ----- قادیانی اور افواج پاکستان
مولانا محمد کلیم اللہ حنفی
- 10 ----- حیاتِ نانوتوی کی روشن قندیلیں (1) -----
مفتی اشتیاق احمد قاسمی
- 14 ----- ڈاکٹر..... مقام اور ذمہ داریاں
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- 21 ----- طلاق کی ضرورت اور صحیح طریقہ -----
مفتی نجیب احمد قاسمی
- 28 ----- شہید ناموسِ شہہ دین، غازی علم دین رحمہ اللہ -----
مولانا محمد کلیم اللہ حنفی
- 33 ----- داعی امت کا وجود -----
محمد عامر قاسمی
- 38 ----- دوسرے خلیفہ پہلے امیر المومنین -----
مولانا محمد الیاس گھمن
- 45 ----- سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما -----
ڈاکٹر ساجد خاکوانی

معمر افراد اور اسلامی تعلیمات

اداریہ

اسلامی تعلیمات میں عمر رسیدہ افراد لائق عزت و تکریم، باعث برکت و رحمت، حصول رزق اور نصرت خداوندی کا سبب ہیں۔

اسلام اس طبقے کو قابل صد احترام بتلاتا ہے، ان کے ساتھ نرم گفتاری، حسن سلوک اور جذبہ خیر خواہی کا حکم دیتا ہے جبکہ ان کی خلاف مزاج باتوں پر صبر و تحمل سے پیش آنے کی تلقین کرتا ہے۔

افسوس کہ آج کے ہمارے انسانی معاشرے میں اس طبقے بالخصوص بوڑھے والدین کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے، اولاد کی پیدائش سے لے کر جوان ہونے تک ان کی تعلیم و تربیت، معاشی کفالت، رہائش و خوراک، علاج معالجہ، خوشی و راحت، مکان، شادی بیاہ اور دیگر مالی و جسمانی اور اخلاقی و تمدنی تمام تر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے والدین اپنی تمام تر توانائیاں قربان کر دیتے ہیں۔

انہیں والدین سے بد سلوکی، بد تمیزی اور بد اخلاقی کے معاملات نے انسانی معاشرے کا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔

عالمی سطح پر اس طبقے کے لیے روایتی حقوق اور ان سے رسمی ہمدردی کی ایک فضا چل پڑی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے کا یہ محروم طبقہ انسانی ہمدردی، عزت و احترام اور جذبہ خیر خواہی سے محرومی کا شکوہ کناں ہے۔

سال بھر میں ان کے لیے ایک دن منالینے سے ان کے خالق کو ہمیشہ کے لیے نہیں منایا جاسکتا۔ بلکہ ان کے حقوق اور عزت و توقیر کے لیے مستقل طور پر

مضبوط حکمت عملی کے ساتھ دیر پا اقدامات کرنا ہوں گے۔

عمر رسیدہ افراد کے حقوق کی بات کرنے والے انہی کو اپنے اور اپنے معاشرے پر بوجھ تصور کرتے ہیں، گھریلو نظام زندگی میں ان کو یکسر بے دخل کرتے ہوئے اولڈ ہومز کے احاطے میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ آتے ہیں جہاں یہ طبقہ پل پل جیتا اور پل پل میں مرتا ہے اور اپنی محبتوں و آرزوؤں کو حسرتوں کے بوسیدہ کفن میں دفن دیتا ہے۔

اسلام ہی روئے زمین پر وہ اکیلا مذہب ہے جو عمر رسیدہ افراد سمیت پوری انسانیت کا میچا ہے، چنانچہ شریعت اسلامی کا ایک معتد بہ حصہ ان کے حقوق کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ انسانیت کو اس سے رہنمائی لینے کی ضرورت ہے۔ آئیے اسلامی نقطہ نظر سے عمر رسیدہ افراد کے معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی حقوق پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

معمر افراد چونکہ عمر کے اس حصے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں صبر و تحمل کم اور چڑچڑاپن کا زیادہ ہو جانا فطری تقاضا بن جاتا ہے اس لیے شریعت اس موقع پر یہ حکم دیتی ہے ان کی باتوں سے دلبرداشتہ ہو کر ان کو عزت و احترام سے محروم نہ کرو۔ چنانچہ جامع الترمذی میں حدیث مبارک موجود ہے اللہ کے آخری اور سچے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے۔“

عمر رسیدہ ہونے کے باوجود یہ طبقہ سماج کا حصہ ہوتا ہے بلکہ اسلام کی نظر میں باقیوں کی نسبت عزت و احترام کا زیادہ حق دار ہوتا ہے اس لیے بطور خاص اس سے حسن سلوک سے پیش آنے کی تلقین کی گئی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس ضمن میں اپنی صحیح بخاری میں اکرام الکبیر

کے عنوان سے باب قائم کیا ہے۔ اس کے تحت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ اخلاقی و معاشرتی قانون گِیَرُ الْکُبَرِ کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے یعنی بڑے کے مرتبے اور عزت کا خیال رکھو۔“

معمر افراد کو بوجھ اور بے کار تصور کرنے والوں کے لیے محسن انسانیت کا یہ فرمان صحیح سمت رہنمائی کرتا ہے اور ان کو باعث برکت بتلاتا ہے۔ چنانچہ

معجم کبیر طبرانی میں ہے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہمارے بڑوں کی وجہ سے ہی ہم میں خیر و برکت ہے۔ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

ہر شخص بشرط زندگی بچپن، لڑکپن اور جوانی کے بہاریں دیکھنے کے بعد بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے اس وقت وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور ان کی خدمت و محبت کا محتاج ہو جاتا ہے، معمر افراد کی عزت و توقیر کرنے سے اللہ کریم ایسے شخص کی یہ منزل آسان فرمادیتے ہیں۔ چنانچہ

جامع الترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو نوجوان کسی معمر شخص کی عمر رسیدگی کے باعث عزت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس نوجوان کے لیے کسی کو مقرر فرمادیتا ہے جو اس کے بڑھاپے میں اس کی عزت کرے۔“

اسلام میں نماز کو اہم العبادات کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن معمر افراد کی رعایت کے پیش نظر اس اہم عبادت کو ہلکی پھلکی پڑھانے کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی پڑھائے کیونکہ ان میں کمزور، بیمار، اور معمر افراد بھی ہوتے ہیں۔“

معمر افراد طبقے کی ایک بڑی مقدار ہمارے گھروں میں بوڑھے والدین کی صورت میں پائی جاتی ہے۔

اس لیے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بطور خاص والدین کے عمر رسیدہ ہونے پر ان سے شفقت سے پیش آنے کا تاکید حکم دیا ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ

”والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں عمر رسیدہ ہو جائیں تو انہیں ”اُف“ بھی نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان دونوں کے ساتھ بڑے ادب سے بات کیا کرو۔ اور ان دونوں کے لیے نرم دلی سے عاجزی و انکساری کے بازو جھکائے رکھو اور (اللہ کے حضور) یہ فریاد کرتے رہو کہ اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے (پیار و محبت سے) پالا تھا“

معمر افراد کا عالمی دن منانے والوں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہدایات ہو سکتی ہیں جو اسلام نے اس ضمن میں تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائی ہیں۔ معمر افراد کا عالمی دن ہو یا کسی بھی طبقے کے حقوق کی بات ہو، اسلام سے بڑھ کر کوئی قانون اور قرار داد ایسی نہیں جس میں مکمل رہنمائی موجود ہو۔

دعا ہے کہ اللہ کریم ہمیں اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے معاشرے میں پھیلی جہالت ختم ہو سکے۔ اللہ کریم ہم سب کو اپنی رضا نصیب فرمائے۔

قادیانی اور افواج پاکستان

مولانا محمد کلیم اللہ حنفی

اسے مشورہ نہ سمجھیے، بلکہ یہ ملک کی سالمیت و استحکام کے لیے نہایت ضروری امر ہے اور ہر محب وطن کے دل کی آواز ہے۔ مملکت خداداد پاکستان عظیم خدائی نعمت ہے جو لاکھوں شہادتوں اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی۔ اس لیے یہاں بسنے والی قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملک کی امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لیے اپنے جذبہ حب الوطنی کو زندہ رکھیں جبکہ افواج پاکستان میں محض جذبہ حب الوطنی ہی کافی نہیں بلکہ اسلامی ملک کے مسلمان سپاہی ہونے کے ناتے جذبہ جہاد کا خوگر ہونا بھی ضروری ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ افواج پاکستان وہ کرایے کے سپاہی نہیں جنہیں چند ٹکوں کے عوض سرحدات کی حفاظت سونپی جائے بلکہ یہ شیر دل سپاہی اپنا ایمانی فریضہ سمجھ کر اسلامی ملک کی حفاظت کرتے ہیں۔ وطن کی محبت اور جذبہ جہاد کے بغیر کوئی شخص افواج پاکستان میں بھرتی ہونے کا قطعاً اہل نہیں، اگرچہ دیکھنے میں چاق و چوبند، کڑیل اور سخیلا جوان ہی کیوں نہ ہو۔ تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ افواج پاکستان میں شمولیت اور اہلیت کا مدار وطن سے محبت اور جذبہ جہاد سے معمور ہونا ہے۔

آئیے! اس تناظر میں دیکھتے ہیں کہ قادیانی لوگ اس میرٹ پر پورا اترتے ہیں یا نہیں؟ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ قادیانی ملک پاکستان کے کھلے دشمن ہیں جس پر بہت سارے شواہد پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن سردست چند عرض کیے دیتا ہوں۔

قادیانیوں کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کا اعترافی بیان

ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ اور بات ہے کہ ہم ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ہوئے تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں۔
(الفضل، ربوہ، ۷۱ مئی ۱۹۴۷ء)

دوسری تاریخی شہادت ملاحظہ فرمائیے: قادیانیوں کے چوتھے خلیفہ مرزا طاہر کا بیان جو انہوں نے 1985ء میں لندن کے سالانہ جلسے پر کیا چنانچہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس ملک پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ آپ (قادیانی) بے فکر رہیں۔ چند دنوں میں (قادیانی) خوشخبری سنیں گے کہ یہ ملک صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو گیا ہے۔

اس سے ان کی پاکستان دشمنی اور اکھنڈ بھارت کا نظریہ بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ کیا اس نظریے سے جذبہ حب الوطنی کا سینہ بے دردی سے چاک نہیں ہو رہا اور کیا اس سوچ اور فکر کے لوگ پاکستان کی افواج میں شامل ہونے کے کسی طور بھی اہل ہو سکتے ہیں؟

اس کے بعد آتے ہیں دوسری بات کی طرف کہ افواج پاکستان جذبہ جہاد کی روگر ہے جبکہ قادیانیوں کے ہاں جہاد کرنا حرام ہے جس جذبے کی بنیاد پر پاکستان کا فوجی مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی کا مصداق بنتا ہے، قادیانی اس کو حرام سمجھتا ہے چند شواہد پیش ہیں۔

مرزا قادیانی خود کہتا ہے کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔

(مجموعہ اشتہارات جلد سوم صفحہ 19)

ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۴۱)

ہر شخص جو میری بیعت کرتا ہے اور مجھ کو مسیح موعود مانتا ہے۔ اسی روز سے
اس کو یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں جہاد قطعاً حرام ہے۔

(روحانی خزائن جلد 17 صفحہ 28)

میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے
اور میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں
اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں
ان سے بھر سکتی ہیں۔ (روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 155)

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دین کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

(روحانی خزائن جلد 17 ص 77)

ایسے بد بخت شخص کو نبی تسلیم کرنے والوں کے دلوں میں بھلا جذبہ جہاد
کیسے ہو سکتا ہے؟ اور یہ کیسے پاکستان کی حفاظت کریں گے بلکہ وطن اور اسلام دشمنی
میں جیسے پہلے برطانوی سامراج سے اپنی وفا کی پیٹنگیں بڑھائیں تھیں اب بھارتی
سورماؤں سے بڑھائیں گے۔

خصوصاً اب جبکہ پاکستان کو مخلص، ایمان دار، محب وطن اور جذبہ جہاد سے
سرشار جوانوں کی ضرورت ہے تو ایسے حالات میں عقلاً، شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً کسی طور
بھی یہ غداران وطن اور دشمنان اسلام قطعاً اسلامی ملک کی فوج اور یہاں کے کسی بھی
ادارے میں اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ الغرض کسی بھی عہدے پر ہر گز ہر گز نہیں آسکتے۔

حیاتِ نانوتوی کی روشن قندیلیں (1)

مفتی اشتیاق احمد قاسمی

مدرس دارالعلوم دیوبند

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (1317ھ) نے حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرمایا: آپ اللہ رب العزت کا شکر ادا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ولی کامل عطا فرمایا ہے کہ انہیں کے سانسوں کے برکت سے اس طرح کے نیک اعمال ظاہر ہو رہے ہیں جو خدا اور رسول خدا کی رضامندی کا باعث ہیں ورنہ یہ دولت اللہ تعالیٰ ہر کسی کو عنایت نہیں فرماتے ہیں۔

(امداد مشتاق ص 203)

گم نامی:

اس ولی کامل نے اپنے کو مٹانے ہی کی کوشش کی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کو کوئی جانے ان کے کارناموں کا ذکر ہو، چنانچہ ارشاد فرمایا: ”اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا، جانوروں کا بھی گھونسلہ ہوتا ہے میرے لیے تو یہ بھی نہ ہوتا اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا۔“ (سوانح قاسمی ج 1 ص 140)

اور ایک دوسرے موقع سے فرمایا: ”لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا۔“

(سوانح قاسمی ج 1 ص 140)

حق میراث کی ادائیگی:

لڑکیوں اور بہنوں کو میراث سے محروم کرنے کے لیے آج لوگ ہزار حیلے

حوالے کرتے ہیں، آج مسلمانوں میں یتیموں، یواؤں اور کمزوروں کے مال کھانے اور ہڑپنے کا رواج پڑا ہوا ہے، دنیا کی محبت میں لوگ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں سنتے، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ شریعت کا قانون بھی ہماری موافقت کرے۔ آج دلوں سے اللہ کا خوف نکل چکا ہے آخرت کی جزا و سزا کا تصور مٹ چکا ہے۔ حضرت نانوتوی جب علم سے فارغ ہوئے تو سب سے پہلے رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کی فکر دامن گیر ہوئی، میراث کی شرعی تخریج مرتب فرمائی اور سب کو ان کا حصہ رسد پہنچا دیا فرائض کی تخریج کا عکس سوانح قاسمی میں موجود ہے، لکھا ہے: جب تحصیل علم سے فارغ ہو کر گھر آئے تو املاک کا جائزہ لیا اور تمام املاک کو مشتبہ اور بعض کو مغضوبہ پایا، والد صاحب کو بہت سمجھایا کہ یہ کمائی ناجائز اور مشتبہ ہے۔ قیامت کے مواخذے کا تقاضا ہے کہ حقیقی حق داروں تک ان کے حصے پہنچا دیے جائیں پھر ان زمینوں کے غلے کے استعمال میں احتیاط فرمائی اور والد صاحب کو بار بار سمجھاتے رہے، یہی نہیں بلکہ مفصل فرائض نکلوائے اور اوپر کی بعید بعید پشتوں کے حقوق اور حصے نکلوائے۔

(سوانح قاسمی ج 1 ص 494)

تقدیر پر اطمینان:

اولیائے کالمین کی طبیعت بالکل معتدل رہتی ہے ان کا ایمان تقدیر پر بالکل کامل رہتا ہے، خوشی کے مناظر سے وہ بہت زیادہ خوش نہیں ہوتے اور مصائب میں وہ زیادہ غمگین نہیں ہوتے۔ ان کا یقین ہوتا ہے: لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا (ہرگز ان کو تکلیف نہیں پہنچ سکتی مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے)

حضرت نانوتوی آخری حج سے واپس ہو رہے تھے کشتی غرق ہوا چاہتی تھی، سارے لوگ گھبرا گئے مگر حضرت پر اطمینان کی کیفیت تھی، ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں

ادھر ادھر قریب غرق ہونے کے جھک جاتی تھیں، کشتی پر جو لوگ سوار تھے ہر ایک کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا، اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے مگر مولانا اپنے حال پر رہے ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے ہوئے نہیں دیکھا، مولوی صاحب اپنے معمولی کام بہ دستور انجام فرماتے رہے۔
(سوانح قاسمی ج 1 ص 282)

حرام و مشتبہ سے نفرت:

عام طور سے آدمی حرام کمانے سے تو احتیاط کرتا ہے مگر دوسرے کے یہاں دعوت وغیرہ کھانے سے احتیاط نہیں کرتا، تاویل کر لیتا ہے کہ داعی کی کمائی حلال و حرام دونوں ہے تو ہم حلال کو سوچ کر قبول کر لیتے ہیں۔ حضرت نانوتوی کا باطن اتنا صاف اور پاکیزہ تھا کہ حرام و مشتبہ کا احساس بھی ہو جاتا تھا اور طبیعت بھی منقبض ہو جاتی تھی، سوانح قاسمی میں ہے: حضرت نانوتوی کو حرام کے طعام سے جیسی نفرت تھی ویسی ہی اس کا احساس بھی بہت جلد کرتے تھے۔
(ج 1 ص 360)

دنیا سے نفرت:

حضرت نانوتوی کو دنیا چھو کر بھی نہیں لگی تھی، آپ دنیا کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا کرتے تھے بڑے بڑے نوابوں نے ملنے کی تمنا کی، مگر کسی سے نہ ملے اور جب بھی ملے دین کے لیے ملے اور بے غرض ملے۔ ایک مرتبہ ایک رئیس صاحب روپے لے کر آئے اور آپ کو پیش کیے، آپ نے انکار کر دیا وہ مایوس ہو کر آپ کی جوتیوں میں ڈال دیا اور سوچا کہ اس طرح اٹھوا لیں گے مگر آپ جوتیوں کو جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور ہنس کر فرمانے لگے: دیکھو! کہ دنیا ہمارے قدموں پر گر گئی ہے اور دنیا دار اس کے قدموں پر گرتے ہیں۔
(سوانح قاسمی ج 1 ص 587)

شیخ الہند رحمہ اللہ نے حضرت نانوتوی کی سادگی اور زہد و استغناء کو بیان

کرتے ہوئے فرمایا: اس منقطع عن المخلوق [مخلوق سے کنارہ کش] اور زاہد فی الدنیا [دنیا سے بے نیاز] کے حجرے میں تو کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا، چٹائی بھی آخر ایک تھی تو وہ بھی ٹوٹی ہوئی۔ گویا عمر بھر کے لیے اس چٹائی کو منتخب کر لیا تھا نہ کوئی صندوق تھا نہ کبھی کپڑوں کی گٹھڑی بندی تھی۔ سفر میں بھی کوئی اہتمام نہ تھا، آخر ایک آدھ کپڑا ہو تو کسی کے پاس رکھوا دیا ورنہ اس ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا جو حضر میں پہنے ہوتے، البتہ ایک نیلی لونگی ساتھ رہتی تھی جب کپڑے زیادہ میلے ہو گئے تو لونگی باندھ کر کپڑے اتار لیے اور خود ہی دھو لیے۔ (سوانح قاسمی ج 1 ص 452)

حضرت نانوتوی نے اپنی اہلیہ کو بھی زہد و قناعت کی تعلیم دی اور عجیب و غریب تربیت فرمائی، خود اہلیہ محترمہ فرماتی ہیں: جب حضرت شب اول میں تشریف لائے تو آتے ہی نوافل شروع فرمائے، نوافل سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس تشریف لائے اور منات و سنجیدگی سے فرمانے لگے جب تم کو اللہ نے میرے ساتھ وابستہ کر دیا ہے تو نبھاؤ کی ضرورت ہے مگر بہ صورت موجودہ نبھاؤ میں دشواری ہے کہ تم امیر ہو اور میں غریب و نادار ہوں۔ صورتیں اب دو ہی ہیں یا میں بھی تو نگر مال دار بنوں یا تم میری طرح نادار بن جاؤ، پھر فرمایا میرا امیر بننا دشوار ہے اس لیے آسان صورت دوسری ہو سکتی ہے کہ تم میری طرح ہو جاؤ۔ یہ سب قول قرار لے کر فرمایا اچھا سب زیور اتار کر مجھے دے دو پھر کپڑوں اور جہیز کے سامانوں پر بھی اختیار کا مطالبہ کیا اور علی الصباح تمام زیورات تمام جوڑے کپڑوں کے اور سارے برتن جو ہزاروں روپے کے تھے سب کا سب چندہ سلطانی (ترکی امدادی فنڈ) میں دے دیا، سسرال والوں نے پھر سارے زیور بنوا دیے حضرت نے دوبارہ سارا سامان چندہ میں دیے دیا۔

(.....جاری ہے)

ڈاکٹر.....مقام اور ذمہ داریاں

ڈاکٹر؛ ہمارے معاشرے کا وہ محسن طبقہ ہے جو صحت مند معاشرہ تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ہمارے ان محسنوں کا شریعت میں مقام کیا ہے اور ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ شرعی نقطہ نظر سے ہمیں بتا رہے ہیں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

کسی بھی سماج میں ڈاکٹر اور معالج کی خاص اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں ایسا وجود عطا کیا ہے جس میں خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خامیوں اور مجبوریوں کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، انسان کی طاقت و قوت کا حال یہ ہے کہ کائنات کی بڑی سے بڑی اور طاقتور سے طاقتور ترین مخلوق بھی انسان کی قوتِ تسخیر کی اسیر ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوری اور ناطقہ کی حالت یہ ہے کہ معمولی کیڑے مکوڑے بھی اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں، ایک بالشت کا سانپ بھی اس کی جان لے سکتا ہے اور بیماریاں اسے آسانی سے بچھاڑ سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں زہر کے ساتھ ساتھ اس کا تریاق بھی پیدا فرمایا ہے اور بیماریوں کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے کے سوا ہر بیماری کی دوا پیدا کی ہے: ”تداووا

فإن الله عز وجل لم يضع داءً إلا وضع له دواءً غير داءٍ واحد اللهم

(سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۸۵۷)

اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور تجربہ کی قوت کو استعمال کرتے ہوئے دواؤں کو دریافت کرے، اس کام کو میڈیکل سائنسٹس اور

ڈاکٹر ز انجام دیتے ہیں، اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی خدمت کے پہلو سے ان کی خدمات نہایت اہم ہیں، بھوکے کو کھانا کھلانا، محتاج کو کپڑے پہنانا، معذور کے کام میں ہاتھ بٹانا اور ضرورت مند کی حاجت پوری کرنا یہ سب مخلوق کی خدمت ہے، لیکن انسان سب سے زیادہ خدمت کا محتاج اس وقت ہوتا ہے جب وہ مریض ہو، بیماری انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ کھانا موجود ہونے کے باوجود وہ کھا نہیں سکتا، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، لیکن وہ ایک قدم چل نہیں سکتا اور تیار داری اور مددگاروں کے رحم و کرم کا محتاج ہو جاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض کی عیادت اور تیمارداری کو بے حد اجر کا باعث قرار دیا ہے، آپ نے فرمایا: جب تک ایک شخص مریض کی عیادت میں رہتا ہے گویا وہ جنت کے باغ میں ہے (مسلم: ۶۵۵۱) اس طرح ڈاکٹر گویا اپنی ڈیوٹی کے پورے وقت اس حدیث کا مصداق ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے اور کون ہے جو انسانوں کے لئے ڈاکٹر اور معالج سے بڑھ کر نفع ہو؟ اس طرح گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ڈاکٹر کو ”خیر الناس“ (بہترین انسان) کا ایوارڈ ملا ہے، ان سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے، فن طب کی اسی اہمیت کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصل علم دو ہی ہیں: فقہ، کہ زندگی گزارنے کا طریقہ معلوم ہو اور طب تاکہ جسم انسانی کی اصلاح پر قدرت ہو سکے، ”العلم علمان: الفقہ للادیان و العلم الطب للابدان“۔

(مفتاح السعادة: ۱/۲۶۷)

واقعہ ہے کہ یہ گروہ انسانیت کا سب سے بڑا محسن ہے اور اس نسبت سے ان کی توقیر و تکریم سماج کا فریضہ ہے، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ علاج سے جلدی فائدہ

نہیں ہوا، یا مریض کی موت واقع ہوئی تو لوگ ڈاکٹر سے الجھ جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو اس کی جان کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں، یہ غیر سنجیدہ طرزِ عمل ہے، اس لئے کہ علاج تو انسان کے اختیار میں ہے، لیکن صحت و شفا خدا کی مشیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، ”وَإِذَا مَرِضْتُ وَهُوَ يَشْفِينِ“ (سورۃ الشعراء: ۸۰)، زندگی کو بچانے کا مکلف قرار دینا اس پر اس کی صلاحیت سے زیادہ بوجھ ڈالنے کے مترادف ہے۔

جو شخص جس مقام کا حامل ہوتا ہے اسی نسبت سے اس کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، اس لئے ڈاکٹر اور معالج حضرات کو اپنی ذمہ داریوں پر بھی توجہ دینی چاہئے، ڈاکٹر کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ اس پیشہ میں خدمت کے پہلو کو مقدم رکھے، ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مریضوں کا مفت علاج کریں اور اپنے گھر سے دوائیں لا کر کھلا دیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس پیشہ کو محض تجارت اور بزنس نہ بنادیا جائے اور اجرت کے ساتھ ساتھ اجر کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جائے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ تعلیم اور علاج نے ایک زبردست کاروبار کی صورت اختیار کر لی ہے اور معاشی کشش کی وجہ سے بہت سے ہوٹل، ہاسپٹل میں تبدیل ہو گئے ہیں، ڈاکٹروں کی فیس مریض کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ بن گئی ہے، پھر فیس کے سلسلے میں بھی ایک نئی روایت یہ قائم ہو رہی ہے کہ مریض جتنی بار مشورے کے لئے جائے ہر بار فیس ادا کرے۔

اس طرح بعض اوقات ہر ہفتہ ڈاکٹر ز فیس وصول کر لیتے ہیں، پھر آمدنی کے بالواسطہ ذرائع بھی پیدا کر لئے گئے ہیں، دوائیں لکھی جاتی ہیں اور مخصوص و متعین دوکانوں سے دوا خرید کرنے کو کہا جاتا ہے، تاکہ ان سے کمیشن مل سکے، مریض پر بوجھ ڈالنے اور اپنی جیب بھرنے کے لئے ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو دوائیں پہلے لکھی گئی تھیں ابھی وہ ختم بھی نہیں ہوئی کہ دوا تبدیل کر دی جاتی ہے اور اسی فارمولہ کی دوسری دوا،

جس کا نام کمپنی بدل جانے کی وجہ سے بدلا ہوا ہوتا ہے، لکھ دی جاتی ہے، بیچارے مریض کو ڈاکٹر صاحب کی اس ہوشیاری کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جتنی دوا مطلوب ہے اس سے زیادہ لکھ دی گئی اور چند دنوں میں نسخہ بدل دیا گیا اور زائد دوائیں بیکار ہو گئیں، یہ بھی ہوتا ہے کہ نقلی دوائیں یا ایسی دوائیں جن کی مدت ختم ہو چکی ہے، دی جاتی ہیں اور معیاری دواؤں کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔

امراض کے ٹیسٹ کا معاملہ تو سب سے سوا ہے، بے مقصد ٹیسٹ کرائے جاتے ہیں، مریض نے اگر کسی دوسرے ڈاکٹر سے ٹیسٹ کرایا ہو تو چاہے وہ رپورٹ دن، دو دن پہلے ہی کی کیوں نہ ہو، لیکن نیا ڈاکٹر پھر سے پورے ٹیسٹ کراتا ہے اور یہ بھی ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر نے جس پیٹھالوجسٹ کا مشورہ دیا ہے اسی کے یہاں ٹیسٹ کرایا جائے۔

ان اقدامات میں مخلصانہ جستجو و تحقیق کا جذبہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، اکثر اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ کمانا اور اپنی جیب بھرنا ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر یا کسی خاص ہسپتال کو مریض ریفر (Refer) کرتا ہے

یہ تمام صورتیں اگر مریض کی بھلائی کے جذبہ سے ہوں تب ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن افسوس کہ ان سب کا مقصد کمیشن کھانا ہوتا ہے، دواؤں پر کمیشن، ٹسٹ پر کمیشن، مریض کے بھیجنے پر کمیشن اور جہاں جہاں ممکن ہو وہاں سے کمیشن کا حصول، ان کمیشنوں اور ان کی بڑھتی ہوئی شرحوں نے مریض کی کمر توڑ دی ہے اور غریب لوگوں کے لئے ہسپتال جانے کا تصور بھی ایک بوجھ ہوتا ہے، یہ کمیشن فقہی اعتبار سے رشوت ہے، اس کا لینا حرام ہے اور اس میں واسطہ بننا بھی حرام ہے۔

حکومت کی طرف سے اس بات پر پابندی ہے کہ سرکاری ہاسپٹلوں میں کام کرنے والے ڈاکٹر الگ سے اپنے نرسنگ ہوم چلائیں، لیکن جسے خدا کا خوف نہ ہو اس کے قدم کون تھام سکتا ہے؟

چنانچہ عام طور پر سرکاری ڈاکٹر ز بھی فرضی ناموں سے نرسنگ ہوم چلاتے ہیں، جو مریض سرکاری ہاسپٹل میں آتا ہے، اسے بے توجہی سے دیکھتے ہیں اور صراحتاً اشارتاً انہیں نرسنگ ہوم میں آنے کی دعوت دی جاتی ہے، یا عملی طور پر انہیں اس پر مجبور کر دیا جاتا ہے؛ تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ پیسے ہتھیائے جاسکیں اس عمل میں جھوٹ بھی ہے اور دھوکہ بھی اور بعض دفعہ پریکٹس نہ کرنے کا الاؤنس بھی دیا جاتا ہے، لہذا اب اس کے باوجود پیسے لے کر پرائیوٹ پریکٹس حرام طریقہ پر مال حاصل کرنے کی مجرمانہ کوشش بھی ہے اور یہ قرآن کے اس ارشاد کہ، باطل طریقے پر مال نہ کھاؤ، کے قطعاً مغایر ہے، ”ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل“۔

(سورۃ بقرہ: ۱۸۸)

اسی طرح ایک نئی صورتِ حال یہ ہے کہ جن امراض کا علاج دواؤں کے ذریعہ ممکن ہے، ان میں بھی آپریشن کا مشورہ دیا جاتا ہے، تاکہ علاج گراں بار ہو اور مریض کی یہ گرانی معالج کے لئے ارزانی کا باعث ہے، خاص کر ولادت کے کیس میں کثرت سے اس طرح کی بات پیش آتی ہے اور آپریشن کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ زچگی کرائی جاتی ہے اور حکومت بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، کیونکہ یہ بالواسطہ فیملی پلاننگ کو بروئے کار لانا ہے۔

اسی طرح مریض کی موت کے باوجود اسے مصنوعی آلہ تنفس پر رکھا جاتا ہے، تاکہ بل بڑھتا رہے، یہ کس درجہ ناشائستہ طریقہ ہے۔

ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ آپریشن کی میز پر پیٹ چیرنے کے بعد ڈاکٹر کی طرف سے نیا مطالبہ سامنے آتا ہے اور مریض اور اس کے متعلقین اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتے ہیں، یہ تمام صورتیں شرعاً ناجائز اور گناہ ہیں، اور اکثر صورتوں میں آمدنی بھی حرام ہے، افسوس کہ بہت سے دیندار لوگ بھی اپنی لا علمی کی وجہ سے ان گناہوں میں مبتلا ہیں، ڈاکٹر کے لئے صرف اس کی تنخواہ اور پرائیوٹ علاج کی صورت میں اس کی فیس، نیز مریض کو اس نے جو دوائیں دی ہیں، ان کی معروف اور مروجہ قیمت ہی جائز ہے۔

معالج کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنے فن کو باضابطہ طور پر پڑھا ہو، محض چند سنی سنائی باتوں پر علاج شروع کر دینا درست نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے طب کا علم حاصل نہ کیا ہو، وہ علاج کرے تو وہ نقصان کا ضامن ہو گا، من تطب ولم یعلم منه قبل ذلك الطب فهو ضامن

(ابوداؤد: ۲/۶۳۰)

اسی لئے فقہاء نے ایسے طبیبوں پر پابندی لگانے کا حکم دیا ہے

(بدائع الصنائع: ۷/۱۶۹)

ناواقف طبیب سے مراد وہ شخص ہے جس میں بیماری اور اس کی دوا کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، دواؤں کے اثرات سے واقف نہ ہو، نیز دوائیں دے دیتا ہو اور اس کے ری ایکشن کو روکنے والی دواؤں کا علم نہ رکھتا ہو: يسقي الناس دواء مهلكا ولا يقدر على ازالة ضرر دواء اشتد تاثيره على المرضى۔

(الفقه الاسلامي وادلته: ۵/۴۴۹)

لہذا ایسے ناواقف اور کوتاہ علم طبیب کی کوتاہیاں قابل ضمان ہوں گی اور ان

کو سزا دی جائے گی، یہ سزا جسمانی سزائیں بھی ہو سکتی ہے، قید بھی اور خوں بہا بھی۔

(بدایۃ المجتہد: ۲/۲۳۳)

جو معالج تعلیم یافتہ ہو، لیکن اس نے علاج میں کوتاہی سے کام لیا ہو، مناسب تحقیق نہیں کی ہو اور اس کی اس کوتاہی کی بنا پر مریض کو نقصان پہنچا ہو تب بھی وہ ذمہ دار ہو گا اور اس سے ہر جانہ وصول کیا جائے گا۔

ہاں اگر اس نے فن طب کو پڑھا بھی ہو اور اصول کے مطابق علاج بھی کیا ہو؛ لیکن اس کے باوجود مریض کو صحت نہیں ہو سکی یا اس کا مرض اور بگڑ گیا، تو اب وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہو گا، چنانچہ

مشہور فقہ علامہ درویش فرماتے ہیں: إذا عالج طبيب عارف ومات المريض عن علاجه المطلوب فلا شيء عليه

(سیر صغیر: ۴/۲۲۰)

افسوس کہ آج کل علاج کی ایسی سنگین کوتاہیاں سامنے آتی ہیں کہ بعض دفعہ تو سرجن قینچی اور چھری بھی مریض کے جسم میں بھول جاتا ہے، ایسے غفلت شعار ڈاکٹر انسانیت کے خادم نہیں ہادام ہیں اور وہ سماج کے لئے رحمت کے بجائے زحمت ہیں، غرض کہ طب و علاج کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور معالج انسانی خدمت کے اعتبار سے سب سے اہم ذمہ داری انجام دیتا ہے، وہ اپنے پیشے میں اجرت کے ساتھ ساتھ اجر اور دنیا کے نفع کے ساتھ آخرت کے نفع کو بھی پاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس پیشے کو محض تجارت کے طور پر اختیار نہ کرے، بلکہ اس میں خدمت کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھے اور جھوٹ، دھوکہ اور حرام طریقہ پر کسبِ معاش سے اپنے دامن کو بچائے۔

طلاق کی ضرورت اور صحیح طریقہ

مفتی نجیب احمد قاسمی

اگر میاں بیوی کے درمیان اختلافات دور نہ ہوں تو قرآن کریم کی سورۃ النساء آیت نمبر ۳۵ کے مطابق دونوں خاندان کے چند افراد کو حکم بنا کر معاملہ طے کرنا چاہئے۔ غرضیکہ ہر ممکن کوشش کی جانی چاہئے کہ ازدواجی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے، لیکن بعض اوقات میاں بیوی میں صلح مشکل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے دونوں کامل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، تو ایسی صورت میں ازدواجی تعلق کو ختم کرنا ہی طریقہ کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسی لئے شریعت اسلامیہ نے طلاق کو جائز قرار دیا ہے۔ طلاق میاں بیوی کے درمیان نکاح کے معاہدہ کو توڑنے کا نام ہے۔ جس کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ دواہم شرائط کے ساتھ صرف ایک طلاق دے دی جائے:

(۱) عورت پاکی کی حالت میں ہو۔

(۲) شوہر عورت کی ایسی پاکی کی حالت میں طلاق دے رہا ہو کہ اس نے

بیوی سے ہم بستری نہ کی ہو۔

صرف ایک طلاق دینے پر عدت کے دوران رجعت بھی کی جاسکتی ہے، یعنی میاں بیوی والے تعلقات کسی نکاح کے بغیر دوبارہ بحال کئے جاسکتے ہیں۔ عدت گزرنے کے بعد اگر میاں بیوی دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو نکاح بھی ہو سکتا ہے۔ نیز عورت عدت کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح بھی کر سکتی ہے۔

غرضیکہ اس طرح طلاق واقع ہونے کے بعد بھی ازدواجی سلسلہ کو بحال کرنا

ممکن ہے اور عورت عدت کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کرنے کا مکمل اختیار بھی رکھتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان صلح کرانے کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں اور طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو صرف ایک طلاق دے دی جائے تاکہ غلطی کا احساس ہونے پر عدت کے دوران رجعت اور عدت گزرنے کے بعد دوبارہ نکاح کرنے کا راستہ کھلا رہے۔ ایک ساتھ تین طلاق دینے سے بالکل بچنا چاہئے کیونکہ اس کے بعد رجعت یا دوبارہ نکاح کرنے کا راستہ بظاہر بند ہو جاتا ہے۔

طلاق کا اختیار مرد کو:

مرد میں عادتاً و طبعاً عورت کی بہ نسبت فکر و تدبیر اور برداشت و تحمل کی قوت زیادہ ہوتی ہے، نیز انسانی خلقت، فطرت، قوت اور صلاحیت کے لحاظ سے اور عقل کے ذریعہ انسان غور و خوض کرے تو یہی نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوت مرد کو عطا کی ہے، بڑے بڑے کام کرنے کی جو صلاحیت مرد کو عطا فرمائی ہے، وہ عورت کو نہیں دی گئی۔ لہذا امارت اور سربراہی کا کام صحیح طور پر مرد ہی انجام دے سکتا ہے۔

اس مسئلہ کے لئے اپنی عقل سے فیصلہ کرنے کے بجائے اس ذات سے پوچھیں جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے۔ چنانچہ خالق کائنات نے قرآن کریم میں واضح الفاظ کے ساتھ اس مسئلہ کا حل پیش کر دیا ہے: (وَاللِّیْ جَالٍ عَلَیْہِیْنَ ذَرَجَاتٍ)

(سورۃ البقرۃ ۲۲۸)

ایک مقام پر یوں ارشاد فرمایا کہ اللّٰی جَالٍ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ

(سورۃ النساء ۳۴)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں ذکر فرمادیا کہ مرد ہی زندگی کے

سفر کا سربراہ رہے گا اور فیصلہ کرنے کا حق مرد ہی کو حاصل ہے، اگرچہ مرد کو چاہئے کہ عورت کو اپنے فیصلوں میں شامل کرے۔ اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ نے طلاق دینے کا اختیار مرد کو دیا ہے۔

خُلع:

لیکن عورت کو مجبور محض نہیں بنایا کہ اگر شوہر بیوی کے حقوق کا حقہ ادا نہیں کر رہا ہے یا بیوی کسی وجہ سے اس کے ساتھ ازدواجی رشتہ کو جاری نہیں رکھنا چاہتی تو عورت کو شریعت اسلامیہ نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے۔ اگر عورت واقعی مظلومہ ہے تو شوہر کی شرعی ذمہ داری ہے کہ اس کے حقوق کی ادائیگی کرے ورنہ عورت کے مطالبہ پر اسے طلاق دیدے خواہ مال کے عوض یا کسی عوض کے بغیر۔

لیکن اگر شوہر طلاق دینے سے انکار کر رہا ہے تو بیوی کو شرعی عدالت میں جانے کا حق حاصل ہے تاکہ مسئلہ کا حل نہ ہونے پر قاضی شوہر کو طلاق دینے پر مجبور کرے۔

اس طرح عدالت کے ذریعہ طلاق واقع ہو جائے گی اور عورت عدت گزار کر دوسری شادی کر سکتی ہے۔ خلع کی شکل میں طلاق بائن پڑتی ہے یعنی اگر دونوں میاں بیوی دوبارہ ایک ساتھ رہنا چاہیں تو رجعت نہیں ہو سکتی بلکہ دوبارہ نکاح ہی کرنا ہوگا، جس کے لئے طرفین کی اجازت ضروری ہے۔

طلاق کی قسمیں:

عمومی طور پر طلاق کی تین قسمیں کی جاتی ہیں: طلاق رجعی، طلاق بائن اور

طلاق مغلظہ۔

طلاقِ رجعی:

واضح الفاظ کے ذریعہ بیوی کو ایک یا دو طلاق دے دی جائے۔ مثلاً شوہر نے بیوی سے کہہ دیا کہ میں نے تجھے طلاق دی۔ یہ وہ طلاق ہے جس سے نکاح فوراً نہیں ٹوٹتا بلکہ عدت پوری ہونے تک باقی رہتا ہے۔ عدت کے دوران مرد جب چاہے طلاق سے رجوع کر کے عورت کو پھر سے بغیر کسی نکاح کے بیوی بنا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ شرعاً رجعت کے لئے بیوی کی رضامندی ضروری نہیں ہے۔

طلاقِ بائن:

ایسے الفاظ کے ذریعہ جو صراحتاً طلاق کے معنی پر دلالت کرنے والے نہ ہوں، جیسے کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو اپنے میکے چلی جا، میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ اس طرح کے الفاظ سے طلاق اسی وقت واقع ہوگی جبکہ شوہر نے ان الفاظ کے ذریعہ طلاق دینے کا ارادہ کیا ہو ورنہ نہیں۔ ان الفاظ کے ذریعہ طلاق بائن پڑتی ہے یعنی نکاح فوراً ختم ہو جاتا ہے، اب نکاح کر کے ہی دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حلال ہو سکتے ہیں۔

طلاقِ مغلطہ:

اکٹھا طور پر یا متفرق طور پر تین طلاق دینا طلاقِ مغلطہ (سخت) ہے، خواہ ایک ہی مجلس میں ہوں یا ایک ہی پاکی میں دی گئی ہوں۔ ایسی صورت میں نہ تو مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے اور نہ ہی دونوں میاں بیوی نکاح کر سکتے ہیں، الّا یہ کہ عورت اپنی مرضی سے کسی دوسرے شخص سے باقاعدہ نکاح کرے اور دونوں نے صحبت بھی کی ہو، پھر یا تو دوسرے شوہر کا انتقال ہو جائے یا دوسرا شوہر اپنی مرضی سے اسے طلاق

دیدے تو پھر یہ عورت دوسرے شوہر کی طلاق یا موت کی عدت کے بعد پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔

اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں اس طرح بیان فرمایا ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ پھر اگر شوہر (تیسری) طلاق دیدے تو وہ (مطلقہ) عورت اس کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے۔ ہاں اگر (دوسرا شوہر بھی) اسے طلاق دیدے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس (نیا نکاح کر کے) دوبارہ واپس آجائیں، بشرطیکہ کہ انہیں یہ غالب گمان ہو کہ وہ اب اللہ کی حدود قائم رکھیں گے۔

اسی کو حلالہ کہا جاتا ہے، جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ اس کے صحیح ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں: دوسرا نکاح صحیح طریقہ سے منعقد ہوا ہو۔ دوسرے شوہر نے ہم بستری بھی کی ہو۔ دوسرا شوہر اپنی مرضی سے طلاق دے یا وفات پا جائے اور دوسری عدت بھی گزر گئی ہو۔ حلالہ کے لئے مشروط نکاح کرنا حرام ہے۔

ایک ساتھ تین طلاق:

طلاق رجعی اور طلاق بائن کی شکلوں میں عمومی طور پر اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی شخص نے بغض الحلال طلاق کے صحیح طریقہ کو چھوڑ کر غیر مشروع طور پر طلاق دے دی مثلاً تین طلاقیں عورت کی ناپاکی کے ایام میں دے دیں، یا ایک ہی طہر میں الگ الگ وقت میں تین طلاقیں دے دیں، یا الگ الگ تین طلاقیں ایسے تین پاکی کے ایام میں دیں جس میں کوئی صحبت کی ہو، یا ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دیں، تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں تین ہی طلاق پڑنے پر پوری امت مسلمہ متفق

ہے، سوائے ایک صورت کے، کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاق دے دے تو کیا ایک واقع ہوگی یا تین۔ جمہور فقہاء و علماء کی رائے کے مطابق تین ہی طلاق واقع ہوں گی۔ فقہاء صحابہ کرام حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عمرو، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین تین ہی طلاق پڑنے کے قائل تھے۔

نیز چاروں امام (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) کی متفق علیہ رائے بھی یہی ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے پر تین ہی واقع ہوں گی، ہند، پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان کے علماء کرام کی بھی یہی رائے ہے۔

۱۳۹۳ھ میں سعودی عرب کے بڑے بڑے علماء کرام کی اکثریت نے بحث و مباحثہ کے بعد قرآن و حدیث کی روشنی میں صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے اقوال کو سامنے رکھ کر یہی فیصلہ کیا تھا کہ ایک وقت میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔ صرف غیر مقلدین کی رائے ہے کہ ایک واقع ہوگی۔

ان حضرات نے جن دلائل کو بنیاد بنا کر ایک مجلس میں تین طلاق دینے پر ایک واقع ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا ہے جمہور فقہاء و علماء و محدثین نے ان کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ۱۴۰۰ سال سے امت مسلمہ کی بہت بڑی تعداد اسی بات پر متفق ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار کی جائیں گی۔

جائز حلالہ:

لہذا اگر کسی شخص نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں تو اختیار رجعت ختم ہو جائے گا نیز میاں بیوی اگر باہمی رضا مندی سے بھی دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو یہ

نکاح درست اور حلال نہیں ہو گا یہاں تک کہ یہ عورت طلاق کی عدت گزارنے کے بعد دوسرے مرد سے نکاح کرے، دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، دونوں ایک دوسرے سے لطف اندوز ہوں یعنی صحبت کریں۔

پھر اگر اتفاق سے یہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے یا وفات پا جائے تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے۔ یہی وہ جائز حلالہ ہے، جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ حلالہ کے انکار کرنا اور تین طلاقیں دینے کے بعد بدستور خاتون کو اپنے پاس رکھنا یا خواتین کا خود بٹھہرنا شریعت کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے مترادف ہے۔ جس سے ایمان کے سلب ہونے کا اندیشہ ہے۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے پر متعدد مواقع پر باقاعدہ طور پر تین ہی طلاق کا فیصلہ صادر کیا جاتا رہا، کسی ایک صحابی کا کوئی اختلاف بھی کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔ لہذا قرآن و حدیث کی روشنی میں جمہور فقہاء کرام خاص کر

❖ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ

❖ امام مالک رحمہ اللہ

❖ امام شافعی رحمہ اللہ

❖ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ

اور ان کے تمام شاگردوں کی متفق علیہ رائے بھی یہی ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے پر تین ہی واقع ہوں گی۔

مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے دلائل پر بحث نہیں کی ہے لیکن میرے دوسرے مضمون میں قرآن و حدیث کے دلائل مذکور ہیں۔

شہید ناموس شہہ دین، غازی علم دین رحمہ اللہ

مولانا محمد کلیم اللہ حنفی

Zarbakaleem313@gmail.com

10 اپریل 1875ء میں بمبئی میں ہندو دھرم کی کوکھ سے جدید فرقہ آریہ سماج نے جنم لیا، اس کا بانی سوامی دیانند سرسوتی تھا، وہ 1824ء میں کاٹھیاواڑ گجرات میں پیدا ہوا، اس نے ہندو دھرم کے از سر نو حدود متعین کیں، بت پرستی سے منع کیا، دیوی دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا، وہ ذات پات کو مذہبی یا فطری تقسیم کے بجائے سیاسی تقسیم کہتے تھے، انہوں نے مذہبی اصلاح پسندی کا آغاز کیا تو تھوڑے ہی عرصے میں پڑھے لکھے ہندو جوق در جوق ان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ آریہ سماج کے لیے باقاعدہ آئین بنایا گیا اور اس کو ہندوستان بھر میں پھیلانے کے لیے منظم منصوبہ بندی کی گئی، 1883ء دیانند سرسوتی کا انتقال ہو گیا۔

دیانند سرسوتی شاطر اور چرب زبان تھا اس وجہ سے اس نے کئی مناظرے کیے اور کتابیں بھی لکھیں۔ اس کے اسلام پر 11 مشہور اعتراض کیے جس کا جواب بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نے انتصار الاسلام، قبلہ نما اور ترکی بہ ترکی میں دیا۔ سرسوتی کی وفات کے کافی عرصے بعد ان کی کتاب "ستیا رتھ پرکاش" جو کہ قرآن پاک کے خلاف لکھی گئی تھی، کوراج پال نامی شخص نے اپنے مکتبے سے شائع کیا۔ اس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک ہندو پروفیسر سوامی پنڈت چمپوتی ایم اے نے کیا۔ اس کتاب کی اشاعت سے مسلمانوں کے دینی و قلبی جذبات مجروح ہوئے رد عمل کے طور پر مسلمانوں نے اس کی اشاعت پر شدید احتجاج کیا لیکن راج پال کے خلاف کوئی

کارروائی نہ ہوئی۔ اسی طرح لاہور کے ایک ہندو پروفیسر سوامی پنڈت چوپتی کی تصنیف کردہ ”رنگیلار سول“ نامی کتاب بھی راج پال نے اپنے مکتبہ سے شائع کر دی۔

میں نے خود ”رنگیلار سول“ نامی کتاب کو از اول تا آخر مکمل پڑھا ہے۔ جس میں مصنف نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ازدواجی زندگی اور تعدد ازواج کو بھونڈے اور تمسخر انگیز پیرائے میں تحریر کیا ہے۔ میری طرح اس کتاب کو پڑھنے سے اس وقت کے مسلمانوں میں بھی شدید اضطراب پیدا ہوا، مسلمانوں نے راج پال کے خلاف قانونی کارروائی کی بہت کوششیں کیں لیکن برطانوی سرکاریہ کہہ کر معاملہ ٹالتی رہی کہ قانون میں گستاخ رسول کے خلاف کارروائی کی کوئی گنجائش نہیں۔

موچی دروازہ لاہور کے جلسہ عام میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ نے عشق رسول سے لبریز خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر کوئی نوجوان میرے نانا کے اس ملعون گستاخ کو ہلاک نہ کر پایا تو حرمت رسول اللہ کی قسم یہ بوڑھا سید زادہ خود اپنے ہاتھوں سے یہ مقدس فریضہ سرانجام دے گا۔

شاہ جی کی اس بات کو سننے والے ہزاروں لوگ تھے، شاہ جی کی اس پر اثر تقریر نے لوگوں کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ چنانچہ 24 ستمبر 1928ء کو یکی دروازہ لاہور کے ایک کشمیری نوجوان خدا بخش نے گستاخ رسول پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن راج پال بچ نکلا۔ غازی خدا بخش کو گرفتاری کے بعد 7 سال کی سزائے گئی، 19 اکتوبر 1928ء کو افغانستان کا ایک نوجوان عبدالعزیز لاہور آیا اور اُس نے راج پال کی دکان کا رخ کیا مگر یہ بد بخت دکان میں موجود نہیں تھا اس کی جگہ اس کا دوست سوامی ستیانند موجود تھا۔ غازی عبدالعزیز نے غلط فہمی میں اس کو راج پال سمجھ کر اس پر حملہ کر کے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اور اسے بھی حکومت وقت نے چودہ سال

کی سزا سنائی۔ ہندو پبلشر راج پال پھر بچ گیا۔ راج پال ان حملوں کے بعد نہایت خوفزدہ رہنے لگا۔ حکومت نے اس کی پشت پناہی کرتے ہوئے دو ہندو سپاہیوں اور ایک سکھ حوالدار کو اس کی حفاظت پر متعین کر دیا۔

شاہ جی رحمہ اللہ کی تقریر سننے والوں میں ایک نوجوان علم دین بھی موجود تھا۔ غازی علم دین 4 دسمبر 1908ء کو کوچہ چابک سواراں رنگ محل لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان پیشے کے اعتبار سے فرنیچر سازی کرتا تھا۔ علم دین کے کانوں میں شاہ جی کے پردرد الفاظ گونجتے رہتے تھے اس نے دل ہی دل میں ٹھان لی کہ کسی بھی قیمت پر اس گستاخ رسول کا کام تمام کر کے رہوں گا۔ چنانچہ علم دین گمٹی بازار میں پہنچے اور وہاں سے اپنے مطلب کی تیز دھار چھری لی۔ اور راج پال کی دکان کا رخ کیا، اس دکان میں کد ارناتھ اور بھگت رام بطور ملازم کام کیا کرتے تھے۔

6 اپریل 1929ء کو غازی علم دین جذبہ ایمانی سے معمور ہو کر راج پال کی دکان پر پہنچا تو کد ارناتھ پچھلے کمرے میں کتابیں رکھ رہا تھا، جبکہ بھگت رام راجپال کے پاس ہی کھڑا تھا۔ راجپال نے درمیانے قد کے گندمی رنگ کے نوجوان کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا، لیکن وہ سوچ بھی نہ سکا کہ موت اس کے اتنے قریب آچکی ہے۔

غازی علم دین نے راج پال پر تیز نوکیلے دھاری دار خنجر اس زور سے وار کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی، کشمیر سے راسماری تک غازی علم دین کی بہادری و جرات ایمانی کا ڈنکا بج گیا۔ عاشقان رسول کے جذبات کا یہ عالم قابل دید تھا کہ اس ہندو گستاخ کے قتل کا عہد کرنے والے باقی نوجوان روتے اور ہاتھ ملتے رہ گئے۔

غازی علم دین کو گرفتار کر لیا گیا اور اور سیشن عدالت میں مقدمہ چلنے کے

بعد انہیں سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا جس کے خلاف عدالت عالیہ میں اپیل دائر کی۔ سیشن کورٹ نے 22 مئی 1929ء کو غازی علم دین کے لئے سزائے موت سنا دی۔ یہ وہ موقع تھا جب قائد اعظم نے غازی علم دین کی سزائے موت کے خلاف لاہور ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی اور عدالت میں موقف اختیار کیا کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر رکیک حملے کرنا اور عوام میں نفرت پھیلانا زیر دفعہ 135 الف جرم ہے لیکن راج پال کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی اُس نے غازی علم دین کو اشتعال دلایا لہذا غازی علم دین کے خلاف زیر دفعہ 302 قتل عمد کی بجائے زیر دفعہ 308 قتل بوجہ اشتعال کارروائی کی جائے جس کی سزا زیادہ سے زیادہ سات سال قید ہے۔

لاہور ہائی کورٹ کے متعصب ہندو جسٹس شادی لال نے اپیل مسترد کر دی اور غازی علم دین کو پھانسی کے لئے میانوالی جیل بھجوا دیا گیا۔ 31 اکتوبر 1929ء کو غازی علم دین کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

تاریخ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ شہید کو میانوالی جیل صبح سات بجے تختہ دار پر لٹکا یا گیا۔ شہسوار شہادت کو آٹھ بجے پھانسی گھاٹ سے اتارنے کے فوراً بعد بہیمانہ انداز میں نوبے بغیر نماز جنازہ ہی دفن کر دیا گیا۔

قانونی و اخلاقی بددیانتی کی یہ دل آزار خبر شام ڈھلے تک پورے ہندوستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

پوری امت مسلمہ ہیجان کی کیفیت سے دوچار تھی، ہر مسلمان کا مطالبہ تھا کہ شہید کی میت کو اس کی وصیت کے مطابق لاہور میں دفن کیا جائے۔ مسلمانوں نے برکت علی محمدن ہال میں علامہ اقبال کی زیر صدارت جلسہ کا پروگرام بنایا۔ یکم نومبر کو علامہ اقبال کے گھر جلسہ منعقد ہوا۔

اگلے روز 2 نومبر کو پروفیشنل مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں علامہ اقبال کی تحریک پر حکومت سے غازی علم دین کی لاش لینے پر اتفاق رائے ہوا۔ 5 نومبر کو علامہ اقبال، محمد شفیع اور دیگر افراد پر مشتمل وفد نے گورنر سے ملاقات کی۔ بالآخر گورنمنٹ نے عوامی احتجاج کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

شہادت کو 15 دن بیت چکے تھے، لاہور آنے سے قبل شہید کی لاش دو ہفتے تک قبر میں دفن رہی۔ آخر کار غازی علم دین کا جسد خاکی بذریعہ ٹرین لاہور لایا گیا۔ مستند روایات کے مطابق غازی علم دین کے جنازے میں چھ لاکھ سے زائد مسلمان شریک تھے۔ بھاٹی چوک لاہور سے لے کر سمن آباد تک لوگ ہی لوگ تھے۔ غازی علم دین کے جسد خاکی کو علامہ اقبال اور سید دیدار علی شاہ نے اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔ جب غازی علم دین کو لحد میں اتار دیا گیا تو مولانا ظفر علی خان نے چیخ کر کہا کہ کاش! یہ مقام آج مجھے نصیب ہوتا۔ یہی وہ موقع تھا جب علامہ اقبال کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے ”اسیں گلاں کر دے رہ گئے تے ترکھاناں دامنڈ ابازی لے گیا۔“

اس منظر کی عکاسی کرتے ہوئے تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ برصغیر میں ہونے والے کسی جنازہ میں عوام الناس کی اتنی بڑی تعداد میں شرکت بہت کم موقع پر نظر آئی، جتنی غازی علم دین شہید کے جنازے میں تھی۔ 14 نومبر 1929 کو غازی علم دین شہید کی وصیت کے مطابق انہیں بہاولپور روڈ کے قریب قبرستان میانی صاحب لاہور میں دفن کیا گیا۔

میانی صاحب قبرستان میں غازی علم دین کے مزار پر میں کئی بار گیا ہوں، آج بھی غازی کی خاموش قبر کی صد اکانوں میں گونج رہی ہے کہ ناموس شہہ دیں صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے جان دینا ہی زندگی ہے۔

داعی امت کا وجود

محمد عامر قاسمی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی دعوت دین، اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک پہنچانے، اور بندوں کو بندوں کی بندگی سے اور دنیا کی تنگی سے اللہ کی وسعت کی طرف بلانے کے لیے کس قدر بے چین اور بے کل تھے، بلکہ ایک بے قرار ہستی تھی جو دعوت دین اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی، ایک تڑپ تھی، کرب تھا، سوز تھا، ایک درد تھا، وہ درد بھی متعدی تھا کہ جس کی لذت کے آشنا دوسرے بھی بن جائیں، اس درد کو ختم کرنے کیسے لیے شدید مخالفت، تحقیر و تذلیل، استہزاء اور ایذا رسانی کے حربے استعمال کیے جاتے رہے، مگر سب بے سود۔

دعوت کے اس سلسلے کو یہ حربے بھی روک نہ سکے، مکہ کی سر زمین تنگ ہوئی تو طائف گئے، کہیں وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے امکان نظر آجائیں، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت سے جو امت وجود پذیر ہوئی وہ خیر امت کہلائی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کی شناخت ٹھہری جیسا کہ رب قدیر نے ارشاد فرمایا:

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔“

(آل عمران: 110)

شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یعنی اس امت کے

بہتر اور اعلیٰ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہوگی، قوت و شوکت ہوگی، اقتدار و سلطنت کی باگ ڈور ہوگی، یہ سب چیزیں محض ضمنی بالتبع اور سایہ ہیں اس امت کی اصل فضیلت اور برتری کے مقابلے میں یہ بالکل ہیچ ہیں، اس امت مرحومہ کی حقیقی بہتری کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کے سبب بہتر ہے اور خیر خواہی اور ہمدردی کی وجہ بھی بیان فرمادی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں بھی خواہی ان کے اسوہ میں داخل ہوگی، چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تاقیامت کسی کو نبوت اور رسالت کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا اور دین اسلام قیامت تک باقی رہنے والی ایک انمول اور گراں مایہ دولت ہے، اس لیے کارِ نبوت کا گراں بوجھ امت مرحومہ کے ایک ایک فرد کے کندھے پر ڈال دیا گیا ہے کہ اب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہم فریضہ یہ امت مرحومہ ادا کرے گی اور اس سے یہ تمام امتوں سے فوقیت لے جائے گی اور اسی سبب سے یہ خیر الامم اور بھلی امت قرار پائے گی، گویا خود ہی نیکی نہیں کرے گی بلکہ بھلکی ہوئی اور گمراہ دنیا کو نہایت دل سوزی اور اخلاص کے ساتھ راہ راست پر لانے کے لیے اپنی قیمتی جان اور سرمایہ بھی کھپائے گی۔ برائی اور بے حیائی اور بدی کو مٹانے کے لیے ہر وقت ساعی رہے گی۔

علامہ شبیر عثمانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ”تقویٰ، اعتصام بحبل اللہ، اتحاد و اتفاق، قومی زندگی اسلامی مواخات، یہ سب چیزیں اس وقت باقی رہ سکتی ہیں، جب کہ مسلمانوں میں ایک جماعت خاص دعوت و ارشاد کے لئے قائم رہے اس کا وظیفہ ہی یہ ہو وہ اپنے قول و فعل سے دنیا کو قرآن کی طرف بلائے، اور جب لوگوں کو اچھے کام میں سست اور برائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے

اور برائی سے روکنے میں مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد عہد صدیقی میں شدید فتنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بڑی فراست، دوراندیشی اور استقامت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہو کر تمام فتنوں کا استیصال فرمایا۔ اور اسی طرح سیدنا عمر فاروقؓ نے بھی بعض دوسرے سرکاری محکموں کی طرح نظام احتساب اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی باقاعدہ محکمہ قائم فرمایا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی اپنے عہد میں اس نظام کو مضبوط بنایا لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے نظام احتساب کے حوالے سے ایک بار پھر حضرت عمر بن خطابؓ کی یاد تازہ کر دی۔ اموی، عباسی اور بعد میں عثمانی خلفاء کے ادوار میں بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا۔ دین کے مرکز سعودی عرب میں آج بھی نظام احتساب کا ادارہ ”ہیئۃ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر“ کے نام سے بڑا موثر کردار ادا کر رہا ہے۔ لیکن یہ امر افسوس ناک ہے کہ جس فکر کے ساتھ محمد بن قاسم اس ملک میں داخل ہوئے تھے، اس فکر کو جلا جھٹنے کی بجائے امراء و سلاطین مملکت اور بادشاہوں نے اس کا خون کر دیا، ان کی فکریں خوبصورت محلات کی تعمیر، بلند و بانگ عمارتیں، تاج محل اور لال قلعہ جیسی عمارتوں پر مرکوز ہو کر رہ گئیں، ہندو مسلم یکجہتی کی بات کر کے مثبت پیغام دینے کی کوشش کی، لیکن اس عظیم ذمہ داری سے پہلو تہی اختیار کیا گیا، جس کی وجہ سے اسے خیر امت قرار دیا گیا تھا، تاریخی حوالے سے اگر ہم بات کریں تو یہ بات چھن کر سامنے آتی ہے کہ سلاطین فرمانرواں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو فراموش کر دیا، جس کا نتیجہ ہے کہ ہم آج بڑی اقلیت میں ہونے کے باوجود اقلیت کا رونا روتے ہیں، اور اپنی شناخت کے باقی اور قائم رکھنے کا مسئلہ

ہمارے لئے آکھڑا ہوا، گستاخی معاف ہو! جس امت نے اپنی اصل شناخت کو ہی فراموش کر دیا ہو، اس کے سامنے اس کی شناخت کا مسئلہ کیا اس کے وجود کے باقی رہنے اور نہ رہنے کا مسئلہ بھی کھڑا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، رب تقدیر کی زمین پر اس کے باقی رہنے کا جواز یہی ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا ڈنکا بجائے، اور اس کے اوامر کو بجالائے اور لوگوں کو روشناس کرائے اور اس کے نواہی سے بچے اور ڈنکے کی چوٹ سے کہے کہ یہ برا ہے، بقول ربیع بن عامر رضی اللہ عنہ کے بندگان خدا کو بندوں کی بندگی سے اور خدائے واحد کی بندگی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف بلائے جس طرح جعفر بن طیّار نے نجاشی کے دربان میں ڈنکے کی چوٹ اور پوری قوت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی۔

معروف اور منکر صرف جزئی امور میں ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ معروف ہر اچھے اور پسندیدہ کام اور منکر ہر برے اور ناپسندیدہ کام کو شامل ہے۔ دین اور عقل کی نظر میں بہت سے کام معروف اور پسندیدہ ہیں جیسے نماز اور دوسرے فروع دین، سچ بولنا، وعدہ کو وفا کرنا، صبر و استقامت، فقراء اور ناداروں کی مدد، عفو و درگزر، امید و رجاء، راہ خدا میں انفاق، صلہ رحم، والدین کا احترام، سلام کرنا، حسن خلق اور اچھا برتاؤ، علم کو اہمیت دینا، پڑوسیوں اور دوستوں کے حقوق کی رعایت، حجاب اسلامی کی رعایت، طہارت و پاکیزگی، ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی اور دیگر سیکڑوں نمونے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں بہت سے ایسے امور پائے جاتے ہیں جنہیں دین اور عقل نے منکر اور ناپسند شمار کیا ہے، جیسے ترک نماز، روزہ نہ رکھنا، حسد، کینوسی، جھوٹ، تکبر، غرور، منافقت، عیب جوئی اور تجسس، افواہ پھیلانا، چغلی خوری، ہوا پرستی، برا بھلا کہنا، جھگڑا کرنا، بد امنی پھیلانا، اندھی تقلید، یتیم کا مال کھا جانا، ظلم اور

ظالم کی حمایت کرنا، مہنگا بیچنا، سود خوری، رشوت لینا، انفرادی اور اجتماعی حقوق کو پامال کرنا وغیرہ وغیرہ۔ بقول مولانا خالد سیف اللہ رحمانی: ”معروف میں تمام نیکیاں داخل ہیں، غیر مسلموں کو دعوت دینا، مسلمانوں کی اصلاح، منکر میں تمام برائیاں شامل ہیں، کفر، شرک، حرام و مکروہات کا ارتکاب وغیرہ۔ بعض اوامر و نواہی کا تعلق تبلیغ، تذکیر اور وعظ و نصیحت کے ساتھ خاص ہے جس پر عمل کرنا والدین، اساتذہ کرام، علماء و فضلاء اور معاشرے کے دیگر افراد پر واجب ہے جس سے افراد میں ایمان، تقویٰ، خلوص، خشیت الہی جیسی صفات پیدا کر کے روح کا تزکیہ اور تطہیر مطلوب ہے۔ بعض اوامر و نواہی کا تعلق حکومت کی طاقت اور قوت نافذہ کے ساتھ خاص ہے۔ مثلاً نظام صلاۃ، نظام زکاۃ، اسلامی نظام معیشت، اسلامی نظام عفت و عصمت اور قوانین حدود وغیرہ جس سے سوسائٹی میں امن و امان، باہمی عزت و احترام اور عدل و انصاف جیسی اقدار کو غالب کر کے پورے معاشرے کی تطہیر اور تزکیہ مطلوب ہے۔ جب تک اوامر و نواہی کے ان دونوں ذرائع کو موثر طریقے سے استعمال نہ کیا جائے معاشرے کا مکمل طور پر تزکیہ اور تطہیر ممکن نہیں۔ مسلم معاشرہ کی یہ اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ برائیوں اور شر و فساد کو اپنے یہاں پھیلنے سے روکیں اور اس کے ازالہ کے لیے ہر ممکن ذرائع سے استفادہ کریں گھر میں ہوں یا باہر۔ مسجد میں ہوں یا بازار میں دکان پر ہوں یا منڈی میں، کھیل کے میدان میں یا اسکول اور مدرسہ میں یہ فریضہ ہمیں ہر جگہ ادا کرنا ہو گا اور گلوبلائزیشن کے اس دور میں سوشل میڈیا پر بھی اس کام کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ کیونکہ پوری دنیا کے انسانوں سے رابطہ رہتا ہے اور ایک دن میں ہم بے شمار لوگوں کے عقیدے درست کر سکتے ہیں، دینی احکام و مسائل سمجھا سکتے ہیں، لوگوں کو دین کی طرف لا سکتے ہیں، امت مسلمہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں!

دوسرے خلیفہ پہلے امیر المومنین

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن

آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے غلام جن کی حکمرانی انسانوں، جانوروں، درندوں حتیٰ کہ آفتاب کی تمازتوں، ہوا کی لہروں، پانی کی موجوں، زمین کی دھڑکنوں اور آگ کے شعلوں نے بسر و چشم قبول کی۔ جسے دنیا عدل الاصحاب، مراد نبوی، امیر المومنین، فاروق اعظم اور مسند خلافت راشدہ کے دوسرے تاجدار کی حیثیت سے یاد کرتی ہے۔

نام و نسب:

نام عمر، کنیت: ابو حفص، معروف لقب: فاروق اعظم ہے۔ امام ابن عبد البر مالکی نے الاستیعاب میں آپ رضی اللہ عنہ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے: عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ بن رباح بن عبد اللہ بن قُوط بن رزاح بن عدی بن کعب القرشی۔ آٹھویں پشت میں آپ کا سلسلہ نسب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔

ولادت:

طبقات ابن سعد میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی ولادت واقعہ فیل کے تیرہ برس بعد ہوئی۔

حلیہ، وضع قطع:

آپ رضی اللہ عنہ کے سیرت نگاروں نے حلیہ یوں بیان کیا ہے: سرخی مائل

سفید رنگت، خوب رو، بارعب، دراز قد، داڑھی مبارک قدرتی طور پر ہلکی جبکہ مونچھیں قدرے گھنی تھیں۔ جسمانی طور پر آپ رضی اللہ عنہ طاقتور پہلوان، چاق و چوبند، مستعد اور انتہائی باہمت انسان تھے۔

خاندانی اوصاف:

انسان کے کردار و عمل میں خاندانی اوصاف کو بہت اہمیت حاصل ہے، آپ رضی اللہ عنہ کے خاندان میں بطور خاص چار چیزیں بہت معروف تھیں۔

نساب: یعنی علم الانساب کے ماہر تھے۔ آپ کے والد اس فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کے اخلاقی حیثیتوں کو عام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتے تھے۔

سفارت: یہ ملکی عہدہ آپ کے خاندان میں چلا آ رہا تھا آپ رضی اللہ عنہ نے بارہا سفارتی امور کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے سفر فرمائے۔

خطابت: آپ فصیح و بلیغ جامع اور معنی خیز گفتگو کرنے والے پر جوش خطیب، بے مثل ادیب تھے۔ آپ کی باتوں میں حکمت و دانائی چھلکتی تھی۔

پہلوانی: خداداد جسمانی طاقت کے باعث آپ کو پہلوانی میں ممتاز مقام حاصل تھا۔

عمر کی ابتدائی عمر:

آپ رضی اللہ عنہ بچپن ہی بے باک، نڈر، شجاع، دلیر اور حق گو تھے۔ کچھ بڑے ہوئے تو لکھنا پڑھنا سیکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عرب کے دستور کے مطابق سپہ گری، گھڑ سواری، شمشیر زنی اور دوسرے جنگی و عسکری مہارتوں میں درجہ کمال تک

پہنچے، ذریعہ معاش تجارت تھا جس کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے دور دراز کے سفر بھی کیے۔

قبولِ اسلام:

دین اسلام کی عزت اور مشن نبوت کے فروغ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دل میں نیک جذبات ہمیشہ موجزن رہتے۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لیے حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ملائم و نازک رحمت والے ہاتھ اٹھے، قلبی جذبات کا ارتعاش ہونٹوں تک پہنچا تو ان الفاظ نے جنم لیا: اللھم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب۔ اے اللہ اسلام کو عمر بن خطاب کے ذریعے عزتیں عطا فرما۔ بیت اللہ کو بسانے والے کی یہ صدا بیت اللہ کے جلال کے جلو میں بارگاہ ایزدی میں شرف قبولیت کے لیے جا پہنچی۔ قدرت نے مراد نبی کے تکمیل میں عمر کو اسلام کی دولت سے نواز دیا۔ آپ چالیسویں نمبر پر اسلام لائے۔

بارگاہ رسالت مآب میں:

امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں حدیث ذکر فرمائی ہے: ”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی: اے اللہ! عمر بن الخطاب کے ذریعے اسلام کو عزت عطا فرما۔

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی الصحیح میں حدیث ذکر فرمائی ہے: ”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب سیدنا عمر ایمان لائے تو جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! عمر کے اسلام لانے پر اہل آسمان یعنی فرشتوں نے بھی خوشی منائی ہے۔

امام طبرانی رحمہ اللہ المعجم الکبیر میں حدیث ذکر کرتے ہیں: ”سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سیدنا عمر کا قبول اسلام ہمارے لئے ایک فتح تھی اور ان کی امارت ایک رحمت تھی، خدا کی قسم ہم بیت اللہ میں نماز پڑھنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔ پھر اس قابل ہوئے کہ ہم نے خانہ کعبہ میں نماز پڑھی۔“

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب جامع الترمذی میں حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر نبی کے لئے دو وزیر اہل آسمان میں سے اور دو وزیر اہل زمین میں سے ہوتے ہیں۔ میرے دو وزیر اہل آسمان میں سے جبرئیل و میکائیل جبکہ اہل زمین میں سے میرے دو وزیر ابو بکر و عمر ہیں۔“

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنی مسند میں حدیث نقل فرماتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے پوچھا: آج کس نے جنازہ پڑھا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: آج کس نے کسی مریض کی تیمارداری کی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: آج کس نے صدقہ کیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج کون روزے سے رہا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واجب ہو گئی، واجب ہو گئی۔ (یعنی عمر کے لئے جنت واجب ہو گئی)

امام دیلمی رحمہ اللہ نے مسند فردوس میں حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضرت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کا چراغ عمر بن الخطاب ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی الصحیح میں حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تم سے پہلی امتوں میں مُحدَّث ہوا کرتے تھے۔ اگر میری امت میں بھی کوئی مُحدَّث ہے تو عمر ہے۔

نوٹ: مُحدَّث کا معنی ہوتا ہے صاحب الہام۔ یعنی جس کے دل میں حق بات من جانب اللہ ڈالی جاتی ہو۔

مدت خلافت اور نمایاں کارنامے:

دس سال چھ ماہ دس دن۔ اس مختصر سی مدت میں جہاں ہر طرف سے اسلام کے دشمن اکٹھے ہو کر شیع اسلام کو گل کرنے کے تانے بانے بن رہے تھے وہاں پر ان اسلام دشمن لوگوں کے لیے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ دعائے نبوی کی تاثیر بن کر اسلام کی عزت میں مزید اضافہ فرما رہے تھے۔ آپ کی حکمت عملی، مومنانہ فراست، انتظامی صلاحیتیں، عدل و انصاف، رعایا پروری، خدا ترسی اور عدیم المثال طرز حکومت کے باعث 22 لاکھ 51 ہزار 30 مربع میل زمین پر اسلامی خلافت کا پرچم لہر اتار ہا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہی خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی توجہ جمع و ترتیب قرآن کی طرف کرائی۔ آپ کی توجہ کہ بدولت قرآن کریم کو ترتیب سے جمع کیا گیا۔

مفتوحہ ممالک میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے مکاتب و مدارس قائم کیے، قاری صاحبان اور ائمہ مساجد کی تنخواہیں مقرر فرمائیں، اسلامی تقویم کا آغاز ہجرت نبوی سے شروع فرمایا اور اس کی ابتداء محرم سے فرمائی۔

مسجد حرام اور مسجد نبوی کی توسیع فرمائی، عرب و عجم کے سنگم پر کوفہ کو آباد فرمایا، بیت المال تعمیر کرائے، یہودیوں کو جزیرہ عرب سے دیس نکالا دیا، دریائے نیل کے نام خط جاری فرمایا، اور قیصر و کسری جیسی سپر پاور طاقتیں پاش پاش ہوئیں۔
مورخین کے محتاط اندازے کے مطابق آپ کے زماہ خلافت میں 3600 علاقے فتح ہوئے۔ 900 جامع مساجد اور 4000 عام مساجد تعمیر ہوئیں۔

اہم فتوحات اور عوامی خدمات:

- ❖ 14 ہجری میں دمشق، بصرہ، بعلبک کے علاقے فتح کئے۔
- ❖ 15 ہجری میں شرق، اردن، یرموک، قادسیہ کے عظیم الشان معرکے ہوئے۔
- ❖ 16 ہجری میں اہلواز، مدائن اور ایران کے کئی علاقے فتح ہوئے نیز اسی سال عراق کو اسلامی حکومت میں شامل کیا گیا۔
- ❖ 16 ہجری کے اواخر میں تکیہ، انطاکیہ، حلب کی فتوحات کے بعد بغیر جنگ بیت المقدس قبضہ میں آگیا۔
- ❖ 18 ہجری میں آپ نے نیشاپور، الجزیرہ
- ❖ 19 ہجری میں قیساریہ
- ❖ 20 ہجری میں مصر
- ❖ 21 ہجری میں اسکندریہ اور نہاوند کو فتح کیا۔

بحیثیت خلیفہ المسلمین آپ رضی اللہ عنہ تمام مفتوحہ علاقوں کا دورہ کیا، ان علاقوں میں کھلی کچھریاں لگوائیں، فوری انصاف کو یقینی بنایا، عوام الناس کی شکایات کو دور کرنے کے لیے احکامات جاری کئے۔ عوام کے دکھ درد اور مسائل کو سمجھنے کے لیے راتوں کو گلی محلوں کے گشت کیے، عوام کی حفاظت کے پیش نظر پہرے دیئے، روٹی

کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضرورتوں کو عوام کی دہلیز تک پہنچایا اور ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے خود ان کے دروازوں تک پہنچے، رعایا پروری کیلئے رات اور دن کا آرام چھوڑ دیا۔

زمانہ قحط میں رعایا پروری کی ایسی مثال قائم کی کہ ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہنے کے لیے اپنی خوراک میں اس قدر سادگی اختیار کی کہ گھی اور زیتون کا استعمال تک چھوڑ دیا۔

برسہا برس سے مالی وسائل کی وسعتوں کے باوجود آج کی ترقی یافتہ حکومتیں ایسی طرز حکومت کی مثال پیش کرنے سے عاجز و بے بس ہیں جو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نامساعد حالات میں قائم فرمائی۔

آپ کی نافذ کردہ اصلاحات، طے کردہ قواعد و ضوابط، مقرر کردہ اصول ہائے جہانبانی آج کے حکمرانوں بالخصوص مسلم دنیا کے حکمرانوں کے لیے دعوت فکر ہیں۔ اگر عدل و انصاف، رعایا پروری، معاشرتی تعمیر و ترقی، اخلاقی تہذیب و تمدن، معاشی استحکام اور قیام امن چاہتے ہیں تو ان کو خلافتِ فاروقی کی روشن قندیل سے رہنمائی لینی ہوگی۔

شہادت:

26 ذوالحجہ کو انہیں ابو لؤکؤ نامی مجوسی نے آپ رضی اللہ عنہ کو حالت نماز میں خنجر کے پے درپے وار کر کے شدید زخمی کر دیا۔ تین دن اسی حالت میں رہے بالآخر یکم محرم الحرام کو شہید ہو گئے اور نبی و صدیق سے رفاقت نبھانے روضہ اطہر میں آرام پذیر ہوئے۔

رضی اللہ عنہ وارضاه

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

ڈاکٹر ساجد خاوانی

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جید صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ہیں اور امت مسلمہ کے صف اول کے فقہاء محدثین و مفسرین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ 614 عیسوی کو پیدا ہوئے جب کہ محسن انسانیت ﷺ نے 610 میں اعلان نبوت فرمایا تھا۔

ان کے والد محترم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تین بیویاں تھیں، قبول اسلام کے بعد صرف ایک بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ مشرف بہ ایمان ہوئیں، انہیں کے بطن سے حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب نے جنم لیا۔ والدین کے قبول اسلام کے باعث حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آغاز شعور سے ہی صحبت ایمان میسر آگئی جو آپ کی نیک طینت طبیعت کو اس طرح راس آئی کہ پھر تاحیات اسی دین کے ساتھ وابستگی آپ کی مقامی و تاریخی پہچان بن گئی۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کم و بیش دس سال کی عمر میں باقاعدہ اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنے والد اور بہن ”حضرت حفصہ“ کے ساتھ مکہ سے مدینہ ہجرت بھی کی، یہی بہن بعد میں ام المومنین بھی بن گئیں۔

آغاز شباب سے قبل سے ہی آپ نبی علیہ السلام کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ان ﷺ کے ایک ایک عمل کو اپنے ذہن و عمل میں محفوظ کرتے چلے جاتے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کم سنی کی وجہ سے جنگ بدر میں شریک

نہ ہو سکے، جنگ احد میں شرکت کی کوشش کی لیکن اجازت نہ مل سکی پس جنگ احزاب میں پہلی دفعہ آپ نے بھرپور شرکت کی اور خندق کی کھدائی اپنا مقدر بھر حصہ ڈالا۔

اگرچہ ہر صحابی رسول ﷺ اپنی جگہ نبی کی سنتوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے اور نبی ﷺ کے ہر طالب علم کی یہ کوشش ہوتی کہ نبی علیہ السلام کے ہر قول و فعل کو اپنے حافظہ و عمل میں محفوظ و مامون کر لے لیکن بعض صحابہ کرام اس مقدس عمل میں دوسروں پر فضیلت لے گئے اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان خاص الخاص اصحاب رسول ﷺ میں سے ہی ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سفر و حضر میں نبی محترم ﷺ کے شانہ بشانہ وہم رکاب ہوتے اور ایک ایک عمل نبوی ﷺ پر گہری نظر رکھتے حتیٰ کہ حجۃ الوداع کے سفر مبارک کے دوران میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اس بات کا بھی علم تھا کہ کہاں کہاں ختمی المرتبت ﷺ نے قیام کیا، کہاں کہاں استراحت فرمائی اور یہاں تک کہ حوائج ضروریہ کی تکمیل کے لیے کہاں کہاں اپنی سواری سے نزول فرمانے کے مقامات بھی آپ کو از بر تھے۔

تأخیات جب بھی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حج کیا تو سنت کے عین مطابق اس طرح کیا کہ راستوں کے انتخاب سے بین السفر استراحت و قیام تک بمطابق سنت اتباع کیا، یہاں تک کہ جس جگہ محسن انسانیت ﷺ نے اجابت فرمائی تھی وہاں بھی آپ رضی اللہ عنہما جا کر بیٹھ گئے اگرچہ آپ کو حاجت نہ تھی اور پھر اٹھ کر چل دیے۔

سنت نبوی ﷺ کا ایک ایک عمل آپ کو اس قدر عزیز تھا کہ آپ ﷺ نے جہاں بیٹھ کر دعا کی وہاں آپ نے بھی بیٹھ کر دعا کی جہاں آپ ﷺ نے کھڑے

ہو کر دعا کی وہاں آپ نے بھی کھڑے ہو کر دعا کی۔

ججاج بن یوسف کے زمانے میں جب کعبۃ اللہ محاصرے میں تھا تو بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عمرے کی نیت سے احرام باندھا لوگوں نے بتایا کہ راستے پر خطر ہیں تب آپ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کو بھی تو صلح حدیبیہ کے سفر میں روک دیا گیا تھا اگر مجھے بھی روک دیا گیا تو میں بھی اسی طرح بمطابق سنت راستے میں ہی قربانی کروں گا اور حلق کر کے تو احرام کھول دوں گا اس طرح ایک اور سنت ادا ہو جائے گی۔

اس کے باوجود کہ عالم شباب کا بہترین حصہ خدمت اقدس ﷺ میں ہی گزارا اور ایک ایک قول و فعل نبی ﷺ بنظر غائر مطالعہ کیا اور اسے اپنی یادداشت و ذہن کے بہترین حصہ میں جگہ عطا کی پھر بھی سنت کے بارے میں حزم و احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اس وقت تک روایت حدیث کے لیے زبان نہ کھولتے تھے جب تک کہ حدیث کے ایک ایک لفظ کے بارے میں روز روشن کی طرح یقین کامل نہ ہوتا۔

احتیاط کا یہی عالم فتویٰ دینے کے معاملے میں بھی ہمیشہ پیش نظر رہا، ایک بار ایک سائل نے کسی معاملے میں فتویٰ دریافت کیا تو صاف بتا دیا کہ مجھے نہیں معلوم، سائل کے جانے بعد خوشی کا اظہار کیا کہ ایک معاملہ میں ظن و تخمین اور قیاس و اندازہ آرائی کی بجائے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

حزم و احتیاط کا یہی عالم ان کے قاضی بننے میں حائل رہا حالانکہ اپنے زمانہ میں ان سے بڑھ کر اور کوئی اس منصب عالیہ کا اہل نہ ہو گا۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ایک بار پیشکش بھی کی کہ مسند قضا پر براجمان ہو جائیں لیکن تقویٰ و احتیاط گزاری کے باعث طبیعت اس طرف مائل نہ ہوئی۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کی طبیعت میں زہد و ریاضت غالب تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رات کا بیشتر حصہ عبادات میں گزارتے تھے، رب کے سامنے گریہ زاری میں بہت کثرت کرتے اور قرآن کی تلاوت کرتے رہتے۔

رحم دلی، شفقت اور رقت قلبی آپ کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ خود مالدار تاجر تھے اور بیت المال سے بھی وظیفہ وصول کرتے تھے لیکن سب کچھ راہ اللہ بانٹ دیتے تھے اور نہ ہی تو خود کبھی مال و متاع جمع کیا بلکہ دوسروں کو بھی اسی رویے کی تلقین کرتے رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے دسترخوان پر ہمیشہ غریبوں اور یتیموں کا ہجوم رہتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ایک دوست میمون بن مخران بتاتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے گھر میں داخل ہو کر موجود سامان کا بغور مشاہدہ کیا اور اس کی قیمت کا اندازہ لگایا، میمون بن مخران کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے گھر کے کل سامان کی قیمت کھینچ تان کر بمشکل ایک سو درہم ہی بنی۔

اس سفید پوشی کی وجہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی غربت قطعاً بھی نہیں تھی بلکہ سخاوت اور درویشانہ طبیعت اور تعامل علی السنت نبوی ﷺ تھی جس نے انہیں وسائل کے ہوتے ہوئے بھی پر تعیش زندگی سے باز رکھا اور سادگی و سادہ لوحی ان کا ہمیشہ و طیرہ حیات رہی۔

حالانکہ انہوں نے بنی امیہ کے دور کا کثیر زمانہ پایا جب مسلمانوں میں دولت کی ریل پیل تھی اور عجمی خزانے بھی مسلمانوں پر اٹھائے پڑے تھے پس اس دور میں

بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بہت گناہیں ہاتھ دھونے سے احتراز کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جرات و بے باکی کا عالم یہ تھا کہ حجاج بن یوسف، جس کے خوف سے بڑے بڑے کاہن تھے اور جس کی سفاکی و ظلم کے چرچے تاریخ کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

اس نے ایک بار کہا کہ عبداللہ بن زبیر نے کتاب اللہ کو مسخ کیا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وہیں کھڑے ہوئے اور اس کے منہ پر کہا کہ تو جھوٹ بولتا ہے، تو جھوٹ بولتا ہے، تو جھوٹ بولتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس بے باکی پر حاضرین پر سناٹا چھا گیا کیونکہ آج تک کسی کو حجاج بن یوسف سے اس طرح کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو عبرت ناک سزا کی دھمکی دی جس پر ماحول کو سانپ سونگھ گیا تب حضرت نے اپنے ہاتھ سے حجاج کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر تو ایسی سزا دے بھی دے گا تو تجھ پر حیرانی نہیں ہوگی کہ تو ایک بے وقوف اور ظالم و جابر حکمران ہے۔

73 ہجری کو حفاظت سنت کا یہ آفتاب ایک مختصر علالت کے بعد تاقیامت غروب ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی متعدد اولادیں تھیں جن میں سے عبدالرحمن بن عبداللہ بن عمر اور سالم بن عبداللہ بن عمر نے کافی شہرت پائی۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ روز محشر ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہو گا اللہ تعالیٰ اسے اس کے گناہ یاد دلائے گا کہ دنیا میں تو نے یہ یہ اور یہ یہ گناہ کیے؟؟

وہ جواب دے گا اے بار الہ جی ہاں یہ سب گناہ مجھ سے سرزد ہوئے، اللہ تعالیٰ کہے گا دنیا میں میں نے ان سب گناہوں پر پردہ ڈال دیا تھا اور آج میں وہ سب تیرے گناہ معاف کرتا ہوں تب اس کے اچھے اور نیک اعمال والا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔

ایک اور حدیث مبارک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مواخات کے موقع پر جب محسن انسانیت ﷺ مہاجرین اور انصار کو باہم بھائی بھائی بنارہے تھے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس حال میں حاضر خدمت اقدس ہوئے کہ غم و اندوہ ان پر سوار تھا اور آنکھوں سے اشک بہتے چلے آرہے تھے، انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول ﷺ آپ لوگوں کو باہم بھائی بھائی بنارہے ہیں اور میرا بھائی کسی کو نہیں بنایا؟؟ اس پر محسن انسانیت ﷺ نے فرمایا تم میرے بھائی ہو، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو امت کے ہاں ایک بہت اہم مقام حاصل ہے، اگرچہ صدیاں بیت گئیں لیکن ان کے فتاویٰ آج بھی استناد و قانونی نظیر کی حیثیت رکھتے ہیں، تفسیر کامیدان ہو یا روایت حدیث کا اور فقہ کے مسائل ہوں یا قانون سازی کے مرحلے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے آج بھی علمائے امت کے ہاں بہت بڑا وزن رکھتی ہے۔

یہ اس دنیا میں انہیں حاصل ہونے والا مقام و مرتبہ ہے جب کہ آخرت کے لیے وہ جنت کے راستوں کا نشان ہیں اور آپ کی شخصیت وہ سنگ میل ہے جس کی شاہراہ دوزخ سے بچاتی ہوئی سیدھی جنت کی طرف جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو، آپ کی کاوشوں کو قبول فرمائے، آمین۔

نماز جمعہ شہر اور بڑے دیہات میں ہی جائز ہے!

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے مہاجر جو مدینہ طیبہ میں آئے وہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں تشریف لانے سے پہلے مدینہ والوں کو سب سے پہلا جمعہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پڑھایا تھا اور جمعہ پڑھنے والوں کی تعداد اس وقت بارہ آدمی تھی۔

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے بھی اپنی مصنف میں امام زہری سے ایک روایت نقل کی ہے، جس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ لکھا ہے:

اخبرنا عبدالرزاق قال اخبرنا معمر عن الزهري قال ابعث رسول الله صلى الله عليه وسلم مصعب بن عمير بن هاشم الى اهل المدينة ليقرئهم القرآن فاستاذن رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يجمع بهم فاذن له رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

(مصنف عبدالرزاق ج 3 ص 160 ناشر: المجلس العلمي وإدارة القرآن كراچی)

حضرت امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ والوں کی طرف حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو قرآن پڑھانے کے لئے بھیجا، تو حضرت مصعب بن عمیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل مدینہ کو جمعہ پڑھانے کی اجازت مانگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو

اجازت دے دی۔

ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جمعہ کا حکم مکہ مکرمہ میں آچکا تھا لیکن کفار کے غلبہ اور شرکی وجہ سے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علی الاعلان اسلام کے اس شعار پر عمل مشکل تھا، اس وجہ سے مکہ مکرمہ میں جمعہ قائم نہ کیا گیا، مدینہ طیبہ میں اس کی ادائیگی کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی اس لئے پہلے مہاجر حضرت مصعب بن عمیر کو اپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

اگر دو آدمیوں کے اکٹھا ہونے سے بھی جمعہ ادا ہو سکتا ہو تا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ میں موجود دوسرے مسلمانوں کے لئے اپنے اپنے گھروں میں دو دو مل کر جمعہ قائم کرنا کیا مشکل تھا؟ گھر میں دو آدمیوں کے مل کر جمعہ پڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

باوجود دو آدمیوں کے مل کر جمعہ پڑھنے کے ممکن ہونے کے مکہ مکرمہ میں نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جمعہ نہ پڑھنا دلیل ہے اس بات کی کہ ہر جگہ دو آدمیوں کے جمع ہونے پر جمعہ کا قیام ناجائز اور اس کے شعار ہونے کے خلاف ہے وگرنہ مکہ مکرمہ میں نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ضرور جمعہ قائم فرماتے۔

یہ بات خاص طور پر ان حضرات کے لئے لمحہ فکریہ ہے جو کہ اس کو دوسری نمازوں کی مثل بتاتے ہیں، پنج وقتی نمازوں کی جماعت مکہ مکرمہ میں ہوتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جمعۃ المبارک کی جماعت نہ ہوئی۔ معلوم ہوا کہ جمعہ اور عام پنج

وقتی نمازوں کے بارے یہ فرق ہے کہ پنج وقتی نماز شہر، چھوٹے بڑے دیہات، حتیٰ کہ جنگل وغیرہ میں بھی ادا کی جاسکتی ہے جبکہ جمعہ کے لیے شہر اور بڑا دیہات ہونا ضروری ہے۔ چھوٹے دیہات اور جنگل میں اس کو قائم نہیں کیا جاسکتا۔

خود غیر مقلد علماء نے بھی مکہ مکرمہ میں جمعہ کی فرضیت کا اقرار کیا ہے چنانچہ معروف غیر مقلد عالم قاضی شوکانی صاحب لکھتے ہیں:

ان الجمعة فرضت على النبي صلى الله عليه وسلم وهو بمكة قبل الهجرة
كما اخرج الطبراني عن ابن عباس فلم يتمكن من اقامتها هنالك من اجل
الكفار فلما هاجر من هاجر من اصحابه الى المدينة كتب اليهم يأمرهم ان
يجتمعوا فجمعوا۔

(نیل الاوطار ج 3 ص ۲۸۳)

بے شک جمعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ ہی میں ہجرت سے پہلے فرض ہو چکا تھا جیسا کہ طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے: لیکن مکہ میں کفار کی وجہ سے قائم نہ کیا جاسکا، سو جب صحابہ کرام میں سے کچھ حضرات ہجرت کر کے مدینہ آگے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریری حکم نامہ کے ذریعے سے جمعہ پڑھنے کے لیے کہا جس کے نتیجے میں صحابہ کرام نے جمعہ شروع کر دیا۔

معروف غیر مقلد عالم اسمعیل سلفی نے بھی لکھا ہے:
مشہور قول کے مطابق جمعہ مکہ میں فرض ہوا لیکن ناہموار حالات کی وجہ سے ادا کرنے کی نوبت نہ آئی۔

(فتاویٰ سلفیہ ص ۹۲ فتاویٰ علمائے حدیث ج ۴ ص ۳۹)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی اپنی مشہور کتاب الاتقان میں لکھا ہے:
ومن امثلة تأخر نزوله عن حكمه.....ومن امثلته ايضا آية الجمعة فانها
مدنية والجمعة فرضت بمكة.

(الاتقان في علوم القرآن ص 80)

جو آیات اپنے حکم نازل ہونے کے بعد نازل ہوئیں ان کی مثالوں میں
سے ایک مثال آیت جمعہ بھی ہے اس لئے کہ یہ آیت مدنی ہے اور جمعہ مکہ مکرمہ
میں فرض ہوا۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ باوجود فرض ہونے کے نبی اقدس صلی اللہ
علیہ وسلم نے مکہ میں جمعہ نہیں پڑھا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں
ایک آدمی کو ساتھ لے کر جمعہ پڑھ سکتے تھے تو اس نظریے کی تردید کے لئے یہی
بات کافی ہے۔

جہاں دو آدمی اکٹھے ہو جائیں وہ جمعہ قائم کر سکتے ہوتے تو نبی اقدس صلی
اللہ علیہ وسلم ایسا ضرور کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا نہ کرنا دلیل ہے اس
بات کی کہ جمعہ ہر جگہ پڑھنا جائز نہیں بلکہ اس کے قیام کی خاص شرائط ہیں۔
جنگل اور چھوٹے دیہات میں جمعہ جائز نہیں:

جمعہ کا قیام چونکہ شعار اسلام سے ہے اس لئے یہ جائز بھی صرف اسی
جگہ ہو گا جہاں مسلمانوں کا جم غفیر عام طور پر موجود رہتا ہو، تاکہ زیادہ سے زیادہ
لوگ نماز جمعہ میں شریک ہو کر اسلام کی شان و شوکت کا ذریعہ بن سکیں۔

جنگلات اور چھوٹے دیہاتوں میں نماز جمعہ جائز بھی نہ ہوگی۔ خود قرآن

وسنت سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ جنگل اور چھوٹے دیہاتوں میں جمعہ جائز نہ ہو۔ اس پر بیسوں دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں چند آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

پہلی دلیل قرآن کریم سے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَادَى لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ.

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کی اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف جلدی جایا کرو اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو یہ بہت بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم جانتے ہو۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ اوثق العری فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ؛ پیش کیا گیا تو آپ نے جنگل اور چھوٹے دیہات میں جمعہ کے عدم جواز پر مذکورہ آیت سے یوں استدلال فرمایا:

بھئی! میں زیادہ تو جانتا نہیں لیکن اتنا کہتا ہوں کہ گاؤں میں جمعہ کا عدم جواز قرآن مجید سے ثابت ہے دیکھو فرمایا گیا ہے: اس (آیت جمعہ) میں جمعہ کے لیے سعی کا حکم دیا گیا جس کے معنی ہیں دوڑنا اور لپک کر چلنا۔ سعی کی نوبت وہیں آسکتی ہے جہاں لمبی مسافت طے کرنی ہو اور گاؤں میں ایسا نہیں ہوتا۔

پھر فرمایا گیا وذروا البیع "یعنی خرید و فروخت چھوڑ دو معلوم ہوا کہ جمعہ کا حکم ایسی جگہ کے لیے ہے جہاں کوئی بڑا بازار اور منڈی وغیرہ ہو اور لوگ وہاں

خرید و فروخت کے معاملہ میں بہت زیادہ مصروف و منہمک ہوں گاؤں میں ایسی مصروفیت کے بازار کہاں؟

آگے فرمایا گیا ہے فاذا قضيت الصلوة فانتشر وافي الارض وابتغوا من فضل الله۔ یعنی بعد نماز زمین میں پھیل کر اپنے ذرائع آمدنی اور دیگر مشاغل میں مصروف ہونے کا حکم ہے، اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایسے مقام پر اس سلسلہ کے مشاغل کثیر تعداد میں اور بہت پھیلے ہوئے ہونے چاہئیں۔

(ماہنامہ البلاغ کراچی ج 16 شمارہ نمبر 2 ص 41-42)

تو اس آیت سے ثابت ہوا کہ جنگل اور چھوٹے دیہات میں جمعہ جائز نہیں اور نہ جنگل اور چھوٹے دیہات کے لوگ اس آیت کے مخاطب ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

سوال یہ ہے کہ بعض حضرات چھوٹے دیہات میں جمعہ کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے۔ اے ایمان والو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑتے ہوئے آؤ! لہذا جو بھی ایمان والے ہیں خواہ شہر اور قصبہ والے ہوں یا چھوٹے دیہات والے سب کو جمعہ کے لیے آنے کا حکم ہے شہر اور قصبہ کے لوگوں کی تخصیص اس آیت کے منافی ہے۔

جواب: یہ اعتراض اور موقف لاعلمی پر مبنی ہے اس لئے کہ اس آیت اور اس قسم کی روایات کے مخاطب صرف وہی اہل ایمان ہیں کہ جن پر جمعہ فرض ہے جن ایمان والوں پر جمعہ فرض نہیں ہے وہ اس آیت کے مصداق نہیں ہیں

کیونکہ یہ آیت اور اس قسم کی روایات مدنی ہیں اور جمعہ تو مکہ مکرمہ ہی میں فرض ہو چکا تھا جیسا کہ اس کی تفصیل عرض کی جا چکی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پس استدلال مجیب کا عموم آیت سے فرضیت جمعہ اہل قریٰ پر درست نہیں ہے اور اصل یہ ہے کہ فرضیت جمعہ پہلے محقق ہو چکی تھی اب جس پر اور جگہ جمعہ فرض تھا اور جہاں ادا ہوتا تھا وہ سب معلوم اور مقرر ہو چکی تھی اور قبل نزول آیت سب قواعد مہد ہو لئے تھے۔ پس اس آیت کریمہ کے اندر جو مومن مخاطب ہیں یہ وہی مومنین ہیں کہ جن پر فرضیت جمعہ مقرر ہو چکی تھی۔ پس اس کے عموم سے کسی کی استثناء کی حاجت نہیں ہے کیونکہ وہ سرے سے داخل ہی نہیں تھے۔

علیٰ ہذا القیاس جو احادیث ان میں عام لفظوں سے وجوب جمعہ بیان کیا گیا ہے اُن سب سے وہ لوگ مذکورہ بالا سب کے سب مستثنیٰ ہیں جیسا کہ آیت شریف ان الذین کفروا سواء علیہم ۱۱ نذر تہم ام لم تنذرہم لا یومنون میں اگرچہ لفظ موصول عام ہے مگر مراد اس سے وہی معدوے چند کافر ہیں کہ جو سابقہ روز ازل میں کافر مقدر ہو چکے تھے جیسے ابو جہل۔ ابو لہب وغیرہانہ کل کفار کیونکہ بعد نزول آیت کے لاکھوں کافر مسلمان ہوئے اگر اس آیت سے عموم جنسی مراد ہوتا تو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

علیٰ ہذا جملہ احادیث واردہ باب جمعہ و آیت جمعہ میں لفظ موصول میں

اہل قریٰ وغیرہ داخل ہی نہیں ہیں کہ تخصیص کی ضرورت پڑے۔

(مجموعہ رسائل حضرت گنگوہی ص 130 '131)

معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت عام نہیں ہے بلکہ خاص ان افراد کے لیے ہے کہ جن پر جمعہ فرض ہے اس آیت سے جمعہ کے عموم اور سب پر اس کی فرضیت پر استدلال ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی آدمی آیت اقیمو الصلوٰۃ۔ نماز قائم کرو۔ سے حائضہ عورت کے لئے نماز کی فرضیت پر استدلال کرے حالانکہ اس پر نماز فرض نہیں۔

یا کوئی اتوا الزکوٰۃ۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ کے ذریعے سب مسلمانوں پر زکوٰۃ کی فرضیت کا قائل ہو حالانکہ فقیر اور مسکین وغیرہ پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

یا کوئی کتب علیکم الصیام کے ذریعے [تم پر روزے فرض کیے گئے] مریض اور مسافر وغیرہ پر رمضان کے مہینے میں روزے کی فرضیت کا قائل ہو حالانکہ رمضان میں عذر والوں کو روزہ چھوڑنا جائز ہے۔

یا کوئی آیت اتموا الحج [حج کو پورا کرو] کے عموم سے سب مسلمانوں کے لئے حج بیت اللہ کی فرضیت کا قائل ہو حالانکہ مسلمان پر حج کے فرض ہونے کی خاص شرائط ہیں۔

تو جس طرح ان آیات کے عموم سے مذکورہ افراد پر مذکورہ احکام فرض نہیں ہوتے اسی طرح آیت جمعہ کے عموم سے سب پر جمعہ فرض نہ ہو گا بلکہ اس کا تعلق شہر اور بڑے قصبہ والوں کے ساتھ ہے۔

خود غیر مقلد علماء بھی اس آیت میں تخصیص کے قائل ہیں چنانچہ

معروف و مشہور غیر مقلد عالم شمس الحق عظیم آبادی صاحب آیت جمعہ کو نقل کرنے کے بعد حضرت طارق بن شہاب کی روایت سے اس کی تخصیص کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور سنن ابی داود ص 412 ج 1 میں ہے: عن طارق بن شہاب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الجمعة حق واجب علی کل مسلم فی جماعة الا اربعة: عبد مملوک ، او امرأة ، او صبی ، او مریض . رواة ابو داؤد . قال: طارق بن شہاب قد راى النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یسمع منه شیئا .

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جمعہ فرض عین ہے ہر مسلمان پر جماعت سے مگر چار آدمیوں پر ایک غلام پر دوسرے عورت پر تیسرے لڑکے پر چوتھے بیمار پر۔ اور ایسا ہی مسافر پر بھی فرض نہیں جیسا کہ ترمذی اور احمد نے مقسم عن ابن عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ کہا ابو داود رحمۃ اللہ نے: طارق بن شہاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا مگر آپ سے کچھ سنا نہیں تو یہ حدیث مرسل صحابی ہوئی اور حاکم نے اس کو مسنداً روایت کیا ہے طارق بن شہاب سے انہوں نے ابو موسیٰ اشعری سے۔

(مجموعہ مقالات و فتاویٰ شمس الحق عظیم آبادی ص 425)

غیر مقلد عالم شمس الحق صاحب نے آیت جمعہ میں حدیث کی وجہ سے تخصیص کر دی کہ مومنوں میں سے:

1: غلام

2: عورت

3: بچے

4: مریض

اور مسافر پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے۔

معروف غیر مقلد عالم اسماعیل سلفی صاحب ابوداؤد اور منتقی ج 2 ص 8 کے حوالہ سے حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جمعہ ہر مسلمان پر فرض ہے البتہ غلام، عورت بچے اور بیمار پر فرض نہیں۔ یہاں دیکھئے اعذار کے لحاظ سے بعض لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستثنیٰ فرمادیا ہے۔

(فتاویٰ سلفیہ ص 76)

غیر مقلد عالم عبداللہ روپڑی صاحب آیت جمعہ میں تخصیص کے حوالہ سے ایک شبہ کا جواب دیتے ہوئے، لکھتے ہیں:

شبہ نمبر 1: یا ایہا الذین امنوا میں حکم عام ہے تو اس حکم سے مذکورہ اشخاص عورت وغیرہ کیوں مستثنیٰ ہے؟

جواب: پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اہل حدیث کے نزدیک حدیث سے کتاب اللہ کی تخصیص ہو سکتی ہے اس لئے عورت وغیرہ کی حدیث نے تخصیص کر دی اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اہل برادری بالاجماع مخصوص ہیں تو یہ آیت عام مخصوص منہ البعض ہو گئی جو ظنی ہے، پس حدیث سے تخصیص ہو گئی۔

(فتاویٰ اہل حدیث ج 2 ص 27، 26، فتاویٰ علمائے حدیث ج 4 ص 131)

معلوم ہوا کہ غیر مقلد علماء کو بھی یہ بات تسلیم ہے کہ حدیث کی وجہ

سے اس آیت میں تخصیص ہو گئی ہے۔ تو پھر دوسری احادیث کی وجہ سے اس آیت میں تخصیص کیوں نہیں ہو سکتی؟

لہذا ماننا پڑے گا کہ خود آیت جمعہ کے مفہوم اور دوسری احادیث کی وجہ سے ہر جگہ جمعہ درست نہیں ہے بلکہ اس کے لئے شہر یا بڑے قصبے کا ہونا ضروری ہے۔ بلکہ صحراء والوں کا استثناء بھی خود ایک معروف غیر مقلد عالم عبدالرحمن بقاغازی پوری صاحب نے تسلیم کیا ہے انہوں نے ایک کتاب اسی مسئلہ پر سرمن یریٰ کے نام سے تصنیف کی ہے، غیر مقلد عالم اسماعیل سلفی صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

احسن القریٰ کا جواب مولانا عبدالرحمن بقاغازی پوری نے لکھا اس کتاب کا نام ہے سرمن رای فی بحث الجمعۃ فی القریٰ یہ کتاب اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، عموماً کتاب کے انداز تحریر میں متانت ہے کہیں معمولی تیزی آگئی ہے ورنہ خوب کتاب ہے۔

(فتاویٰ سلفیہ ص 99 فتاویٰ علمائے حدیث ج 4 ص 46)

عبدالرحمن بقاغازی پوری صاحب اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

باقی رہے اہل صحراء؛ ان کے باب میں حنفیہ کا یہ مسلک ہے کہ ان پر بھی جمعہ فرض نہیں ہے میرے نزدیک اس مسئلہ میں حق بجانب حنفیہ ہیں کیونکہ اہل صحراء کا استثناء حدیث میں صراحتاً وارد ہے۔

(سرمن رای ص 10)

(--- جاری ہے)

پانچ روزہ دورہ تحقیق المسائل کراچی

مولانا محمد ریاض

عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعت وہ واحد جماعت ہے جس کی دن رات کی محنت کا مدار عقائد اسلامیہ اور مسلک اہل السنۃ والجماعت کو دلائل کے ساتھ امت کے سپرد کرنا ہے۔ مزید یہ کہ اسلامی عقائد و نظریات اور مسائل کو اہل الحاد و بدعت کی باطل تاویلات و تشریحات سے محفوظ کرنا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی عید الاضحیٰ کی تعطیلات کے موقع پر روشنی کے شہر کراچی میں پانچ روزہ دورہ تحقیق المسائل کا انعقاد ہے۔

اپنی افادیت و ضرورت کے پیش نظر اہل علم طبقہ میں اس شارٹ کورس کی بہت پذیرائی ہے جو نہی عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعت کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ عید الاضحیٰ کی چھٹیوں میں علماء، مدرسین اور مدارس کے طلباء کو یہ کورس کرایا جا رہا ہے تو کثیر تعداد میں علماء، طلباء اور مدرسین اس کی طرف کھینچے چلے آئے۔

مدرسہ معارف اسلامیہ کراچی کچھ کچھ تشنگان علوم سے بھر گیا جس میں بشمول کراچی، بلوچستان اور اندرون سندھ سے کثیر تعداد میں علماء کرام، ائمہ مساجد، طلباء اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے احباب نے بھرپور شرکت فرمائی، آخر میں شرکاء کی تعداد چھ سو تک رہی۔

عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعت کے ممتاز اور جید علماء کرام نے شرکاء دورہ میں لیکچرز دیے، جس میں دین اسلام کی بنیادی عقائد: توحید باری تعالیٰ، ختم نبوت، ناموس رسالت ﷺ، قرآن کریم کی حقانیت و صداقت، معیار صحابیت اور عقیدہ آخرت

وغیرہ پر قرآن و سنت اور حضرات صحابہ کرام کے اقوال کی روشنی میں طلباء کو روشناس کروایا، دیگر ادیان منسوخہ کے مقابلہ میں دین اسلام کی حقانیت و صداقت کو دلائل کی دنیا میں آشکار کیا۔

عالم اسلام کی معروف علمی و روحانی شخصیت متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ نے شرکاء کو دور حاضر میں علمی و مسلکی کام کرنے کا طریقہ، قوت دلیل کا سہل اور موثر انداز، مشترکہ پلیٹ فارم پر مسلک اہل السنۃ والجماعت کی ترجمان کا ڈھنگ سکھایا اور تربیتی نشستوں میں طلباء کو اکابر پر اعتماد، علم میں پختگی اور تزکیہ باطن پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت پر پر مغز جامع گفتگو کی۔

اسی طرح مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم قاسمی مدیر معارف اسلامیہ نے بطور میزبان اہل علم کی تشریف آوری پر خوب دل کھول کر حق میزبانی ادا کیا اور تمام تر سہولیات شرکاء دورہ کے لیے وقف کر دیں۔ شدید مصروفیت کے باوجود گاہے بگاہے انتظامی امور کی جانچ پڑتال اور دیکھ بھال کرتے رہے۔ کورس میں عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعت کے مرکزی رہنما مولانا ابویوب قادری، مفتی عبدالواحد قریشی، مولانا محمد احمد آف سندھ کے علاوہ عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعت کراچی کے ذمہ داران مفتی شمس الرحمن، مفتی محمد ریاض لودھروی، مفتی سید حسنین شاہ اور مفتی محمد عظیم لدھیانوی نے شرکاء دورہ کو مختلف مسائل پر منفرد انداز میں اسباق پڑھائے۔

روزانہ ذکر اذکار، تلاوت، فرض نماز اور نوافل کی پابندی کے ساتھ اسباق کی ہمہ وقت مصروفیت کے باعث طلباء نے اپنے اندر علمی اور روحانی بالیدگی میں اضافہ محسوس کیا آخر میں قیمتی نصائح کے ساتھ شرکاء میں اسناد تقسیم کی گئی اور یوں بخیر و خوبی یہ شارٹ کورس مکمل ہوا۔ اللہ کریم اس کی افادیت کو عام تام فرمائے۔

لوحِ ایام

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ سرگودھا میں معزز مہمانان گرامی کی آمد اور متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ کے اندرون و بیرون ممالک کے مختلف مسکلی اسفار اہم مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیات سے خصوصی ملاقاتیں

❖ حضرت متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ علمائے دیوبند کے عقائد کی مصدقہ کتاب المہند علی المفند کو سبقاً پڑھانے کے لیے ملائیشیا تشریف لے گئے جہاں انہوں نے سینکڑوں علماء کرام، طلباء اور مساجد کے ائمہ کرام کو المہند میں درج عقائد اپنے خاص انداز میں پڑھائے۔ ملائیشیا کے علماء اور طلباء نے اس کو بہت سراہا اور خواہش کا اظہار کیا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لاتے رہا کریں۔

❖ ماہانہ خانقاہی اجتماع میں متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن نے محرم الحرام کی حوالے سے بہت مفید خطاب کیا اور شہدائے محرم الحرام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں کی قربانیوں کی بدولت آج ہم تک دین پہنچا ہے۔

❖ عالمی اتحاد کے صوبائی ذمہ داران اور مرکزی شوریٰ کا اجلاس ہوا جس میں مسکلی کام اور جماعتی کاز کے حوالے سے مشاورت ہوئی۔

❖ ماہانہ تعلیمی جائزے کا نتیجہ سنایا گیا اور اول دوم سوم آنے والے طلباء کو انعام سے نوازا گیا۔

❖ ملک پاکستان کی معروف علمی شخصیت مولانا قاضی نثار الحسینی صاحب مرکز اہل السنۃ والجماعت میں تشریف لائے۔ اسی طرح محترم نوفل ربانی، مولانا احمد یار لاہوری، محترم بلال غوری و دیگر معزز مہمانان گرامی بھی تشریف لائے۔